1

پاکستان کے مزدور طبقے کی تاریخ (تقسیم سے پہلے)

عالمی اجارہ داریاں اور پاکستان

صحتِ عامہ کی سیاسیات

پاکستان کے بارے میں بنیادی حقائق ۔

فلسفہ

سیاسی معاشیات

تاریخ

سوشیالوجی

نفسیات

ادب

مجموعہ نمبر ۱
ریسرچ فورم پبلی کیشنز
پوسٹ آفس بکس ۳۵۱۱
کراچی نمبر ۵

ناشر: ریسرچ فورم پبلی کیشنز
کراچی
تقسیم کار: مکتبۂ دانیال
وکٹوریہ چیمبرز ۔ ۲
عبداللہ ہارون روڈ کراچی
طبع چہارم جنوری ۱۹۸۸ء
مطبع احمد برادرس کراچی
قیمت ۱۵ روپے

فہرست

پیش لفظ

دانشورانہ سرگرمی کو بیان کرنے اور درست تاریخی و معاشرتی تناظر میں سمجھنے اور ترقی دینے کا سوال سماجی تبدیلی کے بڑے سوال کا انتہائی اہم حصّہ ہے۔ سماجی تبدیلی کی محرک قوتوں کا تجزیہ کرتے ہوئے ان لوگوں کے لیے یہ سوال زیادہ پیچیدہ مگر بنیادی بن جاتا ہے جو خیال اور دانش کو مادی بنیاد کا انعکاس قرار دیتے ہیں، اور پھر اس مادی بنیاد کی چھان پھٹک بھی دانش کے ہتھیار سے کرتے ہیں۔

نظریاتی اور تحقیقی کام جس سماجی شعور کے ساتھ کیا جاتا ہے اسی کے مطابق لوازمات، زاویہ نظر اور طریقہ کار کا متقاضی ہوتا ہے۔ ہمارا یہ دعویٰ نہیں کہ ہم وہ متبادل فکری بنیادیں اور طریقۂ کار دریافت کر چکے ہیں، بلکہ اپنی کم مائیگی کا اعتراف کرتے ہوئے ہم دوستوں سے اشتراکِ عمل کے متمنّی ہیں۔ تاکہ ہم آج کے تقاضوں اور سماجی وجود سے مطابقت رکھتا ہوا ایسا سماجی شعور اُجاگر کر سکیں جو آج کے پیچیدہ سوالات کے جواب فراہم کرنے کی اہلیت رکھتا ہو اور اس سماجی وجود میں مضمر ترقی کے امکانات کو آگے بڑھا سکتا ہو۔

اردو زبان میں نظریاتی، سماجی، معاشی، تحقیقی مطالعے اور تخلیقی تحریر کی روایت سے مطمئن کوئی بھی نہیں ہے۔ طویل عرصے سے اس مسئلے کو سلجھانے کی کوشش ہوتی رہی ہے۔ ہماری یہ پیش کش بھی انھی مساعی کا تسلسل ہے۔ جن دوستوں کی سعی اور حوصلہ افزائی اس میں شامل ہے انھیں بارہا یہ سوال سننا

اور خود سے پوچھنا پڑا ہے کہ کیا ان خطوط پر کام کو مستقل مزاجی سے چلایا جا سکے گا۔ ہم اس روایت کو آگے بڑھانے کے عمل کو اپنی مستقل مزاجی اور نیک نیتی سے مشروط نہیں کرتے اور قارئین سے ان مضامین پر رائے اور مزید تعاون کی طلبگاری کے ساتھ ساتھ اس بات کا اظہار بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ دانشورانہ سرگرمیاں اپنے عصری ماحول سے بیگانہ اور ماوراء نہیں ہوتیں۔ اپنی تاریخ میں سماجی و سیاسی طور پر جس کیفیت میں ہم مبتلا رہے ہیں وہی اس روایت کی کمزوری کا بنیادی سبب ہے گویا بقول غالبؔ :۔

غم اس کو حسرت پروانہ کا ہے اے شعلہ
تیرے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانائی شمع

مگر ملکی، علاقائی اور بین الاقوامی صورت حال کی تبدیلی نے اس روایت کی افزائش کے لیے وہ زیادہ سازگار مادی بنیادیں فراہم کر دی ہیں جو پہلے موجود نہیں تھیں اگر تھیں تو صرف چشم بیش بین کے احاطے تک محدود۔ ہم اپنی کوششوں کو اس چشم پیش بیں اور اس نئی صورتحال کی کشاکش کے نام معنون کرتے ہیں اور عصری ضرورت سے اپنے کام کے تسلسل اور حوصلہ افزائی کی ضمانت کے خواہاں ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ عصری تقاضوں کے ادراک کے بغیر موثر سماجی تبدیلی کا خیال محض خواب بن کر رہ جائے گا۔ اس مجموعے میں جو تحریریں شامل ہیں وہ اس ادراک کے حصول کے لیے مختلف زاویوں سے کی جانے والی کوششوں پر مبنی ہے۔ ان کے (بعض اوقات متضاد) مندرجات سے اختلاف و اتفاق سے ہی مباحثے کی ایسی راہ کھلے گی جو ہمیں نعرے بازی کے بجائے سنجیدہ تحقیق و جستجو کی جانب لے جا سکتی ہے جو اس وقت کی اہم عملی ضرورت ہے۔

پاکستان کے بارے میں بنیادی حقائق

آبادی ۱۹۸۱ء

آبادی	کل آبادی		دیہی آبادی		
پاکستان	۸۴٫۲۵	ملین	۶۰٫۴	ملین	(۷۱٫۶۷ فیصد)
پنجاب	۴۷٫۲۹	"	۳۴٫۲۴	"	(۷۲٫۴ فیصد)
سرحد	۱۱٫۰۶	"	۹٫۳۹	"	(۸۵ فیصد)
بلوچستان	۴٫۳۳	"	۲٫۰۴	"	(۴۸٫۵ فیصد)
سندھ	۱۹٫۰۲	"	۱۰٫۷۸	"	(۵۶٫۶ فیصد)
قبائلی علاقے	۲٫۱۹	"	۲٫۱۹	"	(۱۰۰ فیصد)
اسلام آباد	۰٫۳۴	"	۰٫۱۳	"	(۳۴ فیصد)

پاکستان کی آبادی کا ۵۶ فیصد حصّہ پنجاب میں، ۱۳ فیصد سرحد میں، ۵ فیصد بلوچستان میں اور ۲۲ فیصد سندھ میں بستا ہے۔

- آبادی میں اضافے کی سالانہ شرح : ۳٫۱ فیصد
- مردوں اور عورتوں کی نسبت : ۱۰۰، عورتوں کے مقابلے میں ۱۱۱، مرد
- آبادی کا ۴۳ فیصد حصہ ۲۱، سال سے زائد عمر کے لوگوں پر مشتمل ہے۔
- بچوں میں اموات کی شرح : ۱۴۲ فی ہزار
- پاکستان کی مصروفِ کار آبادی ۲۲٫۶۴ ملین (کل آبادی کا ۲۷٫۶ فیصد)

زراعت	۵۲٫۷ فیصد	کان کنی	۰٫۴ فیصد
صنعت	۹٫۲ فیصد	بجلی گیس پانی	۰٫۶ فیصد

تعمیرات	۴٫۲ فیصد	تجارت ہوٹل	۱۴٫۹ فیصد
ٹرانسپورٹ	۴٫۱ ″	فنانس، انشورنس	[illegible]٫۸ ″
خدمات	۱۳٫۷ ″	بقیہ	۴٫۹ ″

پاکستان کی مسلح افواج پانچ لاکھ۔

زراعت اور صنعت میں مصروف کار آبادی کی نسبت

	۱۹۶۱ء	۱۹۷۲ء	۱۹۸۲ء
زراعت	۵۹ فیصد	۵۶٫۹ فیصد	۵۲٫۷ فیصد
زراعت کے علاوہ	۴۱ ″	۴۳ ″	۴۷٫۳ ″

مشرق وسطیٰ میں کام کرنے والے پاکستانی محنت کشوں کی تعداد ۲۰ لاکھ ہے جن میں سے ۷۰ فیصد کا تعلق پنجاب، ۱۲، فیصد کا تعلق سندھ، ۱۲ فیصد کا سرحد اور ۶، فیصد کا بلوچستان سے ہے۔

- پاکستان کی مجموعی شہری آبادی کا ۶۱ فی صد حصہ ایک لاکھ سے زائد آبادی والے شہروں میں بستا ہے۔

۱۹۸۴ء کی مردم شماری کے مطابق کراچی میں ۶ فیصد سندھی ۱۳ فیصد پنجابی ۸ فیصد پشتون اور ۵۴ فیصد اردو بولنے والے رہتے ہیں۔

ذیانیں اودان میں بولنے والوں کی تعداد۔

پنجابی	۴۸٫۱۷ فی صد	پشتو	۱۳٫۱۴ فی صد
سندھی	۱۱٫۷۷ ″	اردو	۷٫۶ ″
بلوچی	۳٫۰۱ ″	براہوی	۱٫۲ ″
دوسری زبانیں	۲٫۸ ″	سرائیکی	۹٫۸۳ ″

رقبہ

- پاکستان کا کل رقبہ : ۸۰۳،۹۴۰ مربع کلومیٹر (۱۰۰ فی صد)
- پنجاب 〃 〃 : ۲۰۷،۲۷۷ 〃 〃 (۲۵٫۸ 〃)
- سندھ 〃 〃 : ۱۴۲،۲۰۱ 〃 〃 (۱۷٫۷ 〃)
- سرحد 〃 〃 : ۱۰۲،۸۳۵ 〃 〃 (۱۲٫۸ 〃)
- بلوچستان 〃 〃 : ۳۵۰،۲۸۲ 〃 〃 (۴۳٫۶ 〃)

معیشت

- مجموعی قومی پیداوار ۴۱۶،۰۰۰ ملین روپے (۸۴-۱۹۸۳)
- مجموعی پیداوار میں ترقی کی شرح ، ۳٫۹ فیصد (۷۷-۱۹۷۶)
  ۴٫۶ 〃 (۸۴-۱۹۸۳)

- ملک کا پیداواری ڈھانچہ -

خدمات ، انتظامیہ وغیرہ	۵۲٫۴ فیصد
بڑے پیمانے کی صنعت	۱۱٫۳ 〃
چھوٹے پیمانے کی صنعت	۴٫۸ 〃
زراعت جنگلات وغیرہ	۳۱٫۵ 〃

- فی کس آمدنی ۴،۵۳۰ روپے سالانہ -
- قومی بچت : مجموعی آمدنی کا ۱۴٫۴ فیصد
- افراطِ زر کی شرح : ۸٫۴ فیصد (۷۷-۱۹۷۶ء)
- 〃 〃 〃 : ۹٫۶ 〃 (۸۴-۱۹۸۳ء)

جبکہ غیر سرکاری ذرائع کے مطابق یہ شرح ۱۵ سے ۲۰ فیصد کے درمیان ہے۔

- بیرونی قرضہ ۱۲٫۳۹ بلین ڈالر یعنی ہر پاکستانی پر دو ہزار روپے قرضہ ہے۔
- بیرون ملک مقیم پاکستانی محنت کشوں کی آمدنی جو سرکاری ذرائع سے ملک میں آتی ہے ۰٫۱۳ بلین ڈالر (۷۴-۱۹۷۳ء)

۲٫۸ بلین ڈالر (۸۳-۱۹۸۲ء)

- برآمدات و درآمدات:

	برآمدات	درآمدات	فرق
۷۷-۱۹۷۶ء	۱۱٫۲۹ بلین روپے	۲۳٫۰۱ بلین روپے	۱۱٫۷۱ بلین روپے
۸۳-۱۹۸۲ء	۳۴٫۴۴ " "	۶۸٫۱۵ " "	۳۳٫۷۰ " "

- برآمدات کا ڈھانچہ۔

سال	خام مال	نیم صنعتی مصنوعات	صنعتی مصنوعات
۱۹۷۰ء	۱٫۳۳ فیصد	۳٫۲۳ فیصد	۶٫۴۳ فیصد
۱۹۸۱ء	۴۳٫۸ "	۳٫۱۱ "	۹٫۴۴ "

- درآمدات کا ڈھانچہ۔

سال	صنعتی مصنوعات (مشینری وغیرہ)	صنعتی خام مال	اشیاء صرف
۱۹۷۰ء	۴۰٫۵ فیصد	۵٫۱۰ فیصد	۱٫۳۹ فیصد
۱۹۸۱ء	۲۷٫۸ "	۶٫۷ "	۶٫۴۶ فیصد

- تمام کنسورشیم ممالک (امریکہ، کینیڈا، فرانس، مغربی جرمنی، اٹلی، نیدرلینڈ، برطانیہ، ناروے، سویڈن اور جاپان) سے پاکستان اپنی برآمدات کے مقابلے میں تین گنا زیادہ مالیت کی اشیاء درآمد کرتا ہے۔

۔ پاکستان کا سالانہ بجٹ ۔

اخراجات	۷۷-۱۹۷۶ء			۸۵-۱۹۸۴ء		
کل رقم	۳۴،۳۹۴ ملین روپے			۹۸،۵۵۰ ملین روپے		
ترقیاتی اخراجات	۱۵،۳۲۴	"	"	۳۳،۲۹۰	"	"
غیر ترقیاتی اخراجات	۱۹،۰۷۳	"	"	۶۵،۲۶۰	"	"
۱) دفاع	۸،۱۲۰	"	"	۳۰،۲۷۵	"	"

۔ وسائل ۔

	۷۷-۱۹۷۶ء			۸۵-۱۹۸۴ء		
کل رقم	۳۴،۳۹۴ ملین روپے			۹۸،۵۵۰ ملین روپے		
اندرونی (ٹیکس وغیرہ)	۱۶،۱۱۱	"	"	۸۰،۹۹۳	"	"
بیرونی	-			۱۴،۵۳۱	"	"
خسارہ	-			۸،۵۰۱	"	"

۔ ۷۷-۱۹۷۶ میں ترقیاتی اور غیر ترقیاتی اخراجات کی نسبت بالترتیب ۴۴٫۶ اور ۵۵٫۴ فیصد تھی جو ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۳۳٫۷ اور ۶۶٫۲ فیصد ہوگئی ۔

۔ ٹیکسوں میں بالواسطہ (DIRECT) اور بلاواسطہ (INDIRECT) ٹیکسوں کی نسبت بالترتیب ۱۷، اور ۸۳ فیصد ہے ۔

۔ دفاع پر سالانہ ۳۲۹ روپے فی کس، تعلیم پر ۹ روپے فی کس اور صحت پر ۷ روپے فی کس خرچ کیئے جا رہے ہیں ۔

صنعت، مواصلات، ٹرانسپورٹ

- رجسٹرڈ صنعتی کارخانوں کی تعداد - ۶۱۱۷ (۱۹۸۰)
- صنعتی جھگڑے (۱۹۸۳ء)

  صنعتی تنازعات کی تعداد : ۶۳

  حصّہ لینے والے محنت کشوں کی تعداد : ۲۹،۱۶۳ -

  ضائع دن ۵۹۰،۴۰۶
- رجسٹرڈ ٹریڈ یونینوں کی تعداد : ۱،۶۹۸ (۱۹۷۰ء)، ۸،۰۱۷ (۱۹۷۷ء)
- ٹریڈ یونین اراکین کی تعداد : ۱،۵۹۶،۴۳۸ (۱۹۷۷ء)
- **صوبوں کے درمیان صنعت کی تقسیم** - (کارخانوں کی تعداد)

پنجاب	۵۶٫۲ فیصد	سندھ	۴۱٫۶۸ فیصد
سرحد	۴٫۲۹ فیصد	بلوچستان	۰٫۶۲ فیصد

- صنعت میں مجموعی سرمایہ کاری اور پیداوار میں اضافہ

  ۱۴٫۹۶ ملین روپے (۱۹۷۲-۷۷) ۹٫۵۸ ملین روپے

  ۴۰٫۹۶ ″ ″ (۱۹۷۷-۸۲) ۱۹٫۴۵ ″ ″

زراعت

- پاکستان میں زمین کا کل رقبہ ۶۰،۱۲۷ ہزار ایکڑ ہے۔
- زمین کے مالکان کی تعداد ۱۰،۲۷۷ ہزار ہے
- زمین پر ملکیتی ڈھانچہ

پاکستان

- چھوٹے مالکان زمین (۱۲٫۵۰ ایکڑ سے کم) مالکان کی مجموعی تعداد کا ۸۸ فیصد حصّہ ہیں اور زمین کے مجموعی رقبے کا ۴۶ فیصد حصّہ ان کے قبضے میں ہے۔
- درمیانے مالکانِ زمین (۱۲٫۵۰ - ۲۵٫۰ ایکڑ) مالکان کی مجموعی تعداد کا ۸ فیصد حصّہ ہیں اور زمین کے مجموعی رقبے کا ۱۸ فیصد حصہ ان کے قبضے میں ہے۔
- بڑے مالکانِ زمین (۲۵٫۰ ایکڑ سے زیادہ) مالکان کی مجموعی تعداد کا ۴ فیصد حصہ ہیں اور زمین کے مجموعی رقبے کا ۳۶ فیصد حصہ ان کے قبضے میں ہے۔
- پاکستان میں ۱۷ لاکھ کسان بے زمین ہیں۔

پنجاب

- چھوٹے مالکانِ زمین : ۸۸ فی صد قبضے میں زمین : ۵۰ فیصد
- درمیانے مالکان زمین : ۸ " " قبضے میں زمین : ۱۸ "
- بڑے مالکانِ زمین : ۳٫۵ " " قبضے میں زمین : ۳۱ "

سندھ

- چھوٹے مالکان زمین : ۶۴ فیصد قبضے میں زمین : ۲۰ فیصد
- درمیانے مالکانِ زمین : ۱۷ " قبضے میں زمین : ۱۸ فیصد
- بڑے مالکانِ زمین ۱۸ " قبضے میں زمین : ۶۱ فیصد

سرحد

چھوٹے مالکان زمین ۹۶ فیصد قبضے میں زمین : ۶۰ فیصد

درمیانے مالکان زمین : ۸٫۳ فیصد   قبضے میں زمین : ۱۳ فیصد

- بڑے مالکانِ زمین : ۱٫۶ ″   قبضے میں زمین : ۲۶ فیصد

- زراعت میں مجموعی سرمایہ کاری اور پیداوار میں اضافہ۔

۲۷٫۰۳۶ ملین روپے (۷۷-۱۹۷۲ء)   ۲۵٫۷۵ ملین روپے

۴۲٫۵۶۶ ″ ″ (۸۲-۱۹۷۷ء)   ۴۲٫۵۶ ″ ″

- زرعی اجناس کی فی ایکڑ پیداوار

	(۱۹۵۹ تا ۱۹۶۴ء)	(۱۹۷۲ تا ۱۹۷۷ء)
گندم	۳۳۱ کلوگرام	۵۴۰ کلوگرام
چاول	۳۶۳ ″	۶۲۶ ″
کپاس	۹۹ ″	۱۲۰ ″
گنا	۱۲٫۷۵۲ ″	۱۴٫۵۶۶ ″

دیگر شعبہ جات

- بجلی کی پیداوار   ۳۹۸۴، میگاواٹ (۱۹۸۴ء)
- ریلوے لائن کی لمبائی   ۸٫۸۲۲، کلومیٹر
- سڑکوں کی لمبائی   ۹۷٫۵۱۹ کلومیٹر
- ٹی وی سیٹ   ۱٫۱۱۶٫۲۰۰ (۸۳-۱۹۸۲ء)
- ریڈیو   ۱٫۳۲۸٫۲۴۰ -
- تعلیم

خواندگی کی شرح

۱۹۷۲ء   ۱۹۸۱ء

مرد و خواتین	۲۱٫۷ فیصد	۲۳٫۳ فیصد
مرد	۳۰٫۲ ″	۳۱٫۸ ″
خواتین	۱۱٫۶ ″	۱۳٫۷ ″
شہری	۴۱٫۵ ″	۴۳٫۴ ″
دیہی	۱۴٫۳ ″	۱۴٫۸ ″

- ملک کے صرف ۵۰ فیصد بچے جن کی اسکول جانے کی عمر ہے اسکول میں داخل ہیں۔

صحتِ عامہ

ملک کی ۶۰ فیصد آبادی کو ناکافی غذا حاصل ہوتی ہے۔

ملک میں پیدا ہونے والے ۱۰۰ بچوں میں سے ۱۴ پہلے چند مہینوں میں مرجاتے ہیں۔

دیہی علاقوں میں ۵۰ ہزار افراد کو ایک ڈاکٹر جبکہ ساڑھے چار لاکھ افراد کو ایک ہسپتال میسّر ہے۔

ملک کی ۶۷ فیصد آبادی کو پینے کا صاف پانی نہیں ملتا ہے جبکہ دیہی علاقوں میں ایسے افراد کی تعداد ۸۶ فیصد ہے۔

اخبارات و رسائل:

کل تعداد ۱۲۷۱ –

عربی ۲، انگریزی: ۳۴۸، اُردو: ۷۱۵، بلوچی: ۵، گجراتی: ۱۴، پنجابی: ۱، فارسی: ۵، پشتو: ۲۱، سندھی: ۶۰

پاکستان کے مزدور طبقے کی تاریخ

طاہر رضا

دستکاری اور صنعت میں ترقی۔ پاکستانی پرولتاریہ کے پیشرو

پرولتاریہ کی پیدائش تو سرمایہ دارانہ طرز پیداوار کے بطن ہی سے ہوئی، لیکن اس کی جڑیں جاگیری نظام میں بہت دور تک چلی جاتی ہیں۔ مختلف ممالک میں اس کی پیدائش کا عمل وہاں کی سماجی ترقی کے ادوار کی تاریخی خاصیت اور سیاسی نظام کے مطابق اپنی انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ مغربی یورپ کے جاگیردار ممالک میں سرمایہ دارانہ رشتوں کے قیام کی ابتدا چودھویں پندرہویں صدی میں ہوئی جبکہ مشرقی ممالک خصوصاً برصغیر میں ان کا قیام کافی دیر سے عمل میں آیا۔ بیشتر مورخوں کے مطابق برصغیر میں سرمایہ دارانہ رشتوں کی ابتدا یہاں پر برطانوی قبضے سے بیشتر یعنی سولہویں سترھویں صدی میں ہو چکی تھی۔

محنت کی سماجی تقسیم کے عمل کا شدید تر ہوتا، دست کاری کی کاشتکاری اور شہر کی گاؤں سے علیحدگی اور جاگیردارانہ معیشت میں جنس تجارت اور پیسے کے استعمال کے فروغ کے ساتھ ساتھ سرمایہ دارانہ رشتوں کا قیام عمل میں آنا شروع ہوا جب تجارتی سرمائے کا رخ رفتہ رفتہ صنعت کی جانب ہونے لگا اور سادہ قسم

کی بکھری ہوئی دست کاری کی کارگاہوں کی جگہ مرکزی کارخانوں نے لینا شروع کی (۱) سماجی، معاشی، جغرافیائی اور بعض دوسری وجوہات کی بنا پر جنوبی ایشیا کے خطوں میں یہ عمل بیک وقت نہیں ہوا۔ سرحد اور بلوچستان کے پہاڑی علاقوں میں ازمنۂ وسطیٰ کے آخری دور تک آبادی کا زیادہ تر حصّہ گلہ بانی میں مصروف تھا۔ اور قبائلی رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ کے ابتدائی دور میں تھا جب کہ وادیٔ سندھ میں جنس تجارت اور پیسے کے رشتے، زراعت، دست کاری اور چند بڑے تجارتی مراکز قائم ہو چکے تھے۔ (۲)

سندھ اور پنجاب میں جدید قسم کے صنعتی کارخانوں کے قیام سے قبل یہاں دست کاری کے ایسے ریاستی کارخانے موجود تھے جہاں جبری محنت کے علاوہ اجرتی محنت کا بھی رواج تھا۔ اس کے علاوہ دست کاری کی نجی کارگاہیں نمک، کوئلہ، لوہے، سنگ مرمر کی کانیں اور کپڑے، قالین، چمڑے وغیرہ کی گھریلو پیداوار بھی موجود تھی۔ ندوی بہت سے عرب مورخین کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ دسویں صدی میں سندھ میں ایسے بہت سے کارخانے موجود تھے جن میں شکر، قالین اور کپڑے وغیرہ کی پیداوار ہوتی تھی۔ (۳) کارخانے میں مصروف عمل افراد کی تعداد سات آٹھ سے زائد نہیں ہوتی تھی۔ جہاں تک انفرادی دست کاروں کا تعلق ہے تو ان کی کارگاہوں میں اجرتی محنت کا رواج نہیں تھا بلکہ کنبہ کے دیگر افراد دستکار کا ہاتھ بٹاتے تھے۔

سولھویں صدی کے آخر اور سترہویں صدی کے آغاز میں سندھ اور پنجاب دست کاری کی مصنوعات کی زیادہ بڑے پیمانے پر پیداوار شروع ہوئی جس کی وجہ ۱۵۹۰ء میں سندھ میں اکبر کا قبضہ اور اسے مغلیہ سلطنت میں شامل کرنا ہے جس سے پارچہ بافی سمیت کئی دوسری اشیائ کی پیداوار بڑھی اور شہروں کے

تعداد میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ (۴) اکبر کے دورِ حکومت میں ۱۶۰۵-۱۵۵۶ء
شاہی دربار کے لیے شکر اور قالین کا بڑا حصہ سندھ ہی فراہم کرتا تھا۔ پارچہ بافی
کی صنعت کی ترقی میں ہندوستان کے بیرونی ممالک سے تجارتی روابط کے
قائم ہونے کا کردار خاصا اہم ہے ۱۶ ویں اور ۱۷ ویں میں اس امید کے مشرقی
علاقے سے لے کر مشرق وسطیٰ برما، ملایا اور جاوا تک ہندوستانی کپڑے کی
بہت مانگ تھی۔ کپڑے کی مصنوعات کی برآمد پر لگنے والا محصول مغلیہ
سلطنت کے وسائل کا ایک اہم ذریعہ تھا۔ اس لیے یہ محض اتفاق نہیں تھا کہ اکبر
نے کپاس اگانے والے علاقوں (پنجاب اور سندھ) میں کپڑے کی مصنوعات کی
پیداوار میں ترقی کے لیے اقدامات اٹھائے۔ تجارت اور دست کاری کی حوصلہ
افزائی کے لیے تاجروں اور دست کاروں سے محصولات کم کر دیے گئے اور
پیسے کا یکساں نظام رائج کیا گیا۔ خود اکبر کو دربار کے لیے ہر سال ہزاروں کی تعداد
میں قالین، ملبوسات، شالیں، جوتے، ہتھیار، زیورات اور آرائش وزیبائش
سے متعلق دیگر اشیا درکار ہوتی تھیں۔ اس دور میں بھی پہلے کی طرح کارخانوں
میں جبری محنت لینے کا رواج تھا۔ عموماً ریاستی کارخانوں میں کچھ عرصہ کام کرنے کے
بعد یہ دست کار اپنے ذاتی کام کی طرف لوٹ آتے۔ (۵)

دست کاروں کا غیر مستقل بنیادوں پر کام کرنا پیداوار کی مزید ترقی کی راہ
میں بڑی رکاوٹ تھا۔ پیداوار میں اضافے کے لیے اکبر نے جنس کی شکل میں اُجرت
کو پیسوں میں اجرت میں تبدیل کر دیا اور ساتھ ہی بے شمار نئے کارخانوں کا قیام
عمل میں لایا گیا۔ سندھ کے مغلیہ سلطنت میں شامل کرنے کے بعد اکبر نے ٹھٹھہ
میں جہاز سازی کا ایک کارخانہ قائم کیا جس میں سو سے زائد مزدور کام کرتے تھے۔
چونکہ سرکاری کارخانوں میں اجرت زیادہ اونچی تھی۔ اس لیے بہت سے دستکار

رضا کارانہ بنیادوں پر یہاں کام کرنے لگے۔ اسی طرح افلاس زدہ بے روزگار دست کاروں نے بھی معاشرے کی دوسری پرتوں کے ساتھ رفتہ رفتہ اجرتی مزدوروں کی حیثیت اختیار کرنا شروع کی۔ بڑے کارخانوں میں زیادہ جدید آلات پیداوار استعمال ہوتے تھے۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں اکبر نے بہت سے بڑے تاجروں کو پارچہ بافی، فولادی اشیاء تیار کرنے، قالین سازی اور جفت سازی کے کارخانے قائم کرنے کی اجازت دی۔ تاجروں کا وہ حصہ جو بیرونی ممالک سے تجارت کرتا تھا نے ۷ - ۸ کاریگروں پر مشتمل کارگاہیں قائم کرنا شروع کیں لیکن سندھ میں ایسے کارخانوں کی تعداد زیادہ نہ تھی اس لیے زیادہ تر بے روزگاروں نے پنجاب کا رخ کیا جہاں یہ صنعتیں زیادہ ترقی یافتہ تھیں۔ (۶)

پنجاب میں لاہور، ملتان اور سیالکوٹ بہت عرصے سے اعلیٰ معیار کے کپڑے، قالین، زیورات اور ہتھیاروں کی پیداوار کے اہم مراکز تھے۔ علاؤالدین خلجی (۱۳۲۰ - ۱۲۹۰) کے عہد سے یہاں ایسے کارخانے موجود تھے جن میں ۱۵۰ - ۲۰۰ افراد برسرپیکار تھے۔ لاہور اس زمانے کا اہم تجارتی و ثقافتی مرکز سمجھا جاتا تھا۔ (۷) سولھویں صدی کے اختتام اور سترھویں صدی کے آغاز میں پنجاب کی معیشت کو مزید ترقی ملی جب ۱۵۸۴ء میں اکبر نے اپنا دارالحکومت فتح پور سیکری سے لاہور منتقل کر دیا (۸) قلعہ، باغات اور دوسری عمارات کی تعمیر کے لیے سلطنت کے دوسرے حصوں سے ماہر کاریگروں کو لاہور لایا گیا۔ مقامی جولاہوں کی تربیت کے لیے اکبر نے سینکڑوں ایرانی اور یورپی ماہرین کی خدمات حاصل کیں۔ (۹) "اقبال نامہ اکبری" میں بیان کیا جاتا ہے کہ شالیں بنانے کے بے شمار کاریگروں کو کشمیر سے پنجاب مدعو کیا گیا جنھوں نے اس پیچیدہ ہنر کو متعارف کروایا۔ جلاہے کو ایک شال بننے پر اس کی قیمت کا ۱/۵ حصہ حاصل ہوتا تھا۔

(۹) پارچہ بافی، تعمیرات اور دوسرے شعبوں کی ترقی نے پنجاب کے شہروں میں پیداواری قوتوں کی ترقی اور بڑے شہروں میں کارخانوں کے ارتکاز کے عمل کو بڑھاوا دیا اور تجارت و دست کاری سے وابستہ افراد کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ بہت سے انفرادی جلاہوں، جفت سازوں اور فولاد کی اشیائے تیار کرنے والے دست کاروں نے جو کچھ سرمایہ جمع کر چکے تھے اپنی کارگاہوں کو وسعت دینا شروع کی اور اپنے تنگ دست، افلاس میں مبتلا ہونے والے رفیقوں کو اجرت پر ملازم رکھنا شروع کر دیا (۱۰) ایسی کارگاہوں میں شاگردوں کے علاوہ ۱۲ - ۱۰، افراد کام کرتے تھے جنھیں ۵ روپے ماہانہ اجرت ملتی تھی۔ اکبر اور جہانگیر کے دور کی مختلف دستاویزات میں اس حقیقت کا ثبوت موجود ہے کہ عمارات کی تعمیر، کارگاہوں اور تجارتی اداروں وغیرہ میں اجرتی محنت وسیع پیمانے پر رائج تھی خصوصاً اینٹوں کے بھٹوں پر ———— اجرتی محنت کا استعمال خاصا وسیع تھا۔ سترھویں صدی کے آغاز میں لاہور میں ایسے ۸۰ مستقل بھٹے موجود تھے جن میں ۲۰ سے لے کر ۲۵ مزدور تک کام کرتے تھے۔ یہ بھٹے صرف دو سوداگروں کی ملکیت تھے۔ (۱۱)

ہندوستانی دانشور ہمایوں کبیر اکبر کی ان اصلاحات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ اقدامات فیوڈل طریقہ پیداوار پر سرمایہ داری کی زبردست فتح کا پیش خیمہ تھے۔ لیکن بعض وجوہات کی بنا پر یہ عمل اس وقت تکمیل کے مراحل تک نہ پہنچ سکا۔ (۱۲) شہری آبادی کی مجموعی تعداد میں نجی کارگاہوں اور کارخانوں میں برسرِکار اجرتی مزدوروں کی تعداد انتہائی کم تھی اس کے باوجود اجرتی محنت کا رواج، افلاس زدہ دست کاروں کی ایک خاص تعداد کارگاہوں اور کارخانوں میں ارتکاز بے شک وہ ابتدائی شکل میں تھے سرمایہ دارانہ طرزِ پیداوار کی پیدائش کا بین ثبوت تھے۔

ستر ویں صدی میں سندھ کی سیاحت کرنے والے یورپی باشندوں کے مطابق ٹھٹھہ ایک ترقی یافتہ تجارتی مرکز تھا اور یہاں پارچہ بافی کی ۴۰ ہزار کھڈیاں تھیں (۱۲) برطانوی جہاز راں اے ہملٹن کے مطابق سماجی، معاشی اور ثقافتی لحاظ سے ٹھٹھہ کسی بھی یورپی شہر سے پیچھے نہیں تھا اور یہاں ہر اس چیز کی پیداوار ہوتی تھی جو انسان کے لیے لازم و ملزوم ہے۔ (۱۲) اٹھارویں صدی میں سندھ کی ۳۰ فیصد آبادی شہروں میں رہتی تھی (۱۳) شہری آبادی کی اتنی اونچی شرح ہمیں یورپی ممالک میں بھی دکھائی نہیں دیتی۔

سترویں صدی کے اختتام اور اٹھارویں صدی کے آغاز میں صوبہ ملتان کے شہر بہاولپور، ڈیرہ غازی خان اور ڈیرہ اسماعیل خان بھی دست کاری کی اشیائی پیداوار میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ یہاں پر کارخانے تو موجود نہیں تھے لیکن دستکار اکیلے یا چند کاریگر اکٹھے ہو کر ایک کارگاہ میں کام کرتے ایسی جگہوں کو ہم کاری کہا جاتا تھا۔

شہروں میں دست کاری کی اشیاء کی پیداوار بڑھنے اور جنس تجارت و پیسے کے رشتے کے فروغ سے دیہی آبادی کے سماجی ڈھانچے پر گہرے اثرات مرتب ہوئے پنجاب اور سندھ میں جہاں کپاس کی پیداوار کافی ترقی یافتہ تھی۔ دیہی آبادی کے کاشت کار افراد فارغ اوقات میں روئی کو بیج سے علیحدہ کرتے اور سوت کی تیاری اور خوردنی تیل کی پیداوار میں حصہ لیتے۔ ان دیہات میں جہاں گنا کاشت ہوتا تھا وہاں شکر تیار کی جاتی۔ بلوچوں، پشتونوں اور دیگر قبائل میں نمدے، قالین اور چمڑے کی تیاری کا کام ہوتا تھا۔ سترویں صدی کے آغاز میں وادی سندھ میں واقع دیہات کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ ہر گاؤں اپنا مستقل بڑھئی، لوہار، موچی اور حجام رکھتا تھا۔ گاؤں میں دست کاروں کا تعلق سماج کی سب سے نچلی پرتوں سے ہوتا

اور گاؤں میں تنگ دستی اور نا انصافی بہت سے پیشہ ور دستکاروں کو آہستہ آہستہ گاؤں چھوڑنے پر مجبور کر رہی تھی۔ سترویں صدی کے اختتام تک سندھ کے دیہات میں کپڑے، جوتے، قالین اور لوہے کی پیداوار تقریباً مفقود ہو چکی تھی۔ دست کاری کے مختلف پیشوں سے متعلق کاریگروں نے اپنی پیداوار کو شہری منڈیوں میں لانا شروع کر دیا۔ (۱۴)

دیہی دست کاروں کے گاؤں سے شہر کی جانب منتقل ہونے اور شہر اور گاؤں میں تجارت کو فروغ ملنے سے جنس و پیسے کے رشتے مضبوط ہوئے جس نے دیہی برادری کی توڑ پھوڑ میں بنیادی کردار ادا کیا۔ دیہی دست کاروں کے گاؤں سے نکلنے سے پرانے شہر مزید پھیلے اور نئے شہروں نے جنم لیا۔ سترویں صدی کے پہلے نصف میں قدیم کشمور کے ارد گرد شکارپور (۱۶۱۷) خیر پور (۱۶۲۸) خان پور (۱۶۳۸) اور جام پور (۱۶۴۳) جیسے نئے شہروں کی بنیاد پڑی۔ کچھ عرصہ بعد کراچی (۱۷۲۹) اور حیدر آباد (۱۷۶۸) قائم ہوئے۔

اٹھارویں صدی کے اوائل میں مرہٹوں کی جنگِ آزادی، جاٹوں کی بغاوت اور سکھوں کی جاگیردار مخالف تحریک نے مغلیہ سلطنت میں رخنے ڈال دیے۔ بیشتر کارخانے یا تو بند ہو گئے یا پھر بڑے جاگیرداروں کی نجی ملکیت میں چلے گئے۔ کارخانوں کے بند ہو جانے سے شہروں میں بے روزگار پیشہ ور ہنرمندوں کی تعداد میں اضافہ ہوا دست کاری کی اشیاء کے بڑے تاجروں کے لیے یہ سنہری موقع تھا کہ وہ سستی محنت کو بروئے کار لاتے ہوئے نجی کارخانے کھولتے۔ اِس طرح ٹھٹھہ، شکارپور اور خیرپور میں ایسے بہت سے کارخانے قائم ہوئے جن میں ۲۰-۲۵ مزدور کام کرتے تھے۔

(۱۴) ۱۷۷۵ء میں کلہوڑوں اور تالپوروں کے درمیان لڑائی نے معیشت کو کافی نقصان پہنچایا، لیکن اس کے باوجود کراچی اور حیدر آباد اور شکارپور میں دست کاری اور

تجارت میں ترقی نظر آتی ہے۔ اس زمانے میں سندھ کی سیاحت کرنے والے عبیداللہ
اُمیر لکھتے ہیں کہ یہاں سے بہت سی اشیاء کابل، قندھار، ہرات اور بخارہ تک
بھیجی جاتی تھیں جس کے بدلے وہاں سے دوسری اُشیاء کی درآمد ہوتی۔ (۱۵)
انیسویں صدی کے اوائل تک سندھ کے ہندو تاجروں کی سرگرمیاں کافی بڑھ چکی
تھیں۔ صرف ۳۶-۱۸۰۹ء کے درمیان انھوں نے کپڑے، چمڑے، فولاد اور دیگر
اشیاء کے ۳۰۰، کارخانے قائم کیے۔ (۱۶) ان تمام کارخانوں میں محنت کی تقسیم موجود
تھی۔ زیادہ تر تجارت بھی ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔ مثلاً شکارپور میں واقع ۱۲۷۶،
دکانوں میں سے ۹۲۳ ہندوؤں کی ملکیت میں تھیں۔ (۱۷) مسلمان زیادہ تر کاشت
کاری سے وابستہ تھے جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ دست کاری اور تجارت کو تب تک
ایک ہیچ کام سمجھا جاتا تھا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں سندھ کے شہروں کی آبادی میں
بھی کافی اضافہ ہوا۔ ۱۸۴۰ء میں سندھ کے شہروں کی مجموعی آبادی دولاکھ ساٹھ ہزار ہو
چکی تھی جن میں سے پچاس ہزار افراد دست کاری کے پیشوں سے متعلق تھے۔ (۱۸)
جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ پنجاب کی تجارتی و معاشی زندگی قدیم زمانوں سے
افغانستان کے راستے آنے والے کاروانوں سے منسلک تھی۔ ۱۶۶۶ء میں مغلیہ سلطنت
اور ایران کے درمیان تعلقات بگڑنے کے بعد اورنگ زیب نے افغانستان کے ذریعے
تجارت پر پابندی عائد کردی (۱۹) جس کے نتیجے میں پنجاب سے دست کاری کی مصنوعات
کی برآمد میں نمایاں کمی ہوئی اور ریشمی اور سوتی کپڑے، شالیں، زیورات اور قالین
کے بیشتر کارخانے اپنی پیداوار جاری نہ رکھ سکے۔ اسی عرصے میں مرکزی حکومت کے
کمزور پڑ جانے سے پنجاب کے جاگیرداروں کے مابین لڑائیوں نے شدت اختیار کی۔
جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے احمد شاہ درانی نے ۱۷۵۷ء میں پنجاب پر قبضہ کرلیا۔
افغانی لشکروں کی متعدد یلغاروں نے معاشی زندگی کو مفلوج کر کے رکھ دیا۔ اٹھارویں

صدی کے اختتام تک پنجاب بہت سی جاگیر دار ریاستوں میں بٹ چکا تھا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں رنجیت سنگھ نے ان ریاستوں کو یکجا کرتے ہوئے مرکزی سکھ ریاست قائم کی جس سے معاشی ترقی کے لیے راہ پھر سے ہموار ہوئی۔ دست کاری اور تجارت کی ترقی سے شہری آبادی میں بھی نمایاں اضافہ ہوا۔ انیسویں صدی کے وسط تک لاہور کی آبادی ۹۴ ہزار، ملتان کی ۵۰ ہزار اور سیالکوٹ کی آبادی ۵۶ ہزار کو چھو رہی تھی۔ ان کے علاوہ ۳۲ ایسے شہر موجود تھے جن کی آبادی پانچ سے دس ہزار تک تھی (۲۰) برطانوی قبضے کے وقت بڑے شہروں کے پاس ضلعی منڈیاں موجود تھیں لیکن پنجاب پر برطانوی قبضے نے یہاں کی سماجی و معاشی ترقی میں بہت بڑی رکاوٹ کھڑی کر دی۔

انیسویں صدی میں سرحد اور بلوچستان کے علاقوں میں بھی جاگیر دارانہ طرز پیدا وار نمودار ہو چکا تھا اور طبقاتی جاگیر دار سماج قبائیلی نظام کی جگہ لے رہا تھا۔ اٹھارویں صدی کے وسط تک بلوچستان بہت سی ریاستوں میں تقسیم تھا۔ ناصر خان (۱۷۹۵ - ۱۷۵۰ء) کے دور حکومت میں ان ریاستوں کو متحد جاگیر دار ریاست میں منظم کر دیا گیا۔ اس عرصے میں ہندوستان، افغانستان، ایران سے بہت سے کاریگروں کو بلوچستان مدعو کیا گیا۔ بلوچستان کے محدود شہروں میں آبادی کی بڑی تعداد غیر بلوچی تھی۔ زیادہ تر تجارت پیشہ لوگ ملتان اور شکارپور سے تعلق رکھتے تھے۔ (۲) انیسویں صدی کے اوائل تک بلوچستان ایران، عرب اور ہندوستان کو نمدہ، قالین اور دست کاری کی دوسری مصنوعات برآمد کرتا تھا (۲۱) برادری کے دست کار خوانین اور ملکوں کے لیے بیگار پہ کام کرتے جس میں کوئی اجرت ادا نہیں کی جاتی تھی۔ (۲۲) اُن علاقوں میں جو اب صوبہ سرحد میں شامل ہیں اجناس تجارت کے تبادلے کے بڑھنے اور جنس و پیسے کے رشتے کے وجود میں آنے سے رفتہ رفتہ زیادہ آبادی

والے علاقوں کے نواح میں منڈیاں قائم ہونے لگیں۔ (۲) بعض دست کاروں نے یہاں پارچہ بافی اور زیورات اور جفت سازی کی کارگاہیں بھی قائم کیں جن میں اجرتی محنت استعمال ہوتی تھی۔ برطانوی مقبوضہ بننے کے وقت یہاں بہت سے ایسے کارخانے موجود تھے جو مقامی جاگیرداروں یا بڑے سوداگروں کی ملکیت تھے اور جہاں ۱۵ - ۲۰ مزدور کام کرتے تھے (۲۳)

اکبر کے عہد حکومت میں دست کاروں کی اوسط ماہانہ آمدنی ۵۔۱ - ۰۰۔۱ روپیہ تھی جب کہ ہنرمند مزدور کارخانے میں دو روپے ماہانہ حاصل کرتا تھا۔ بڑے نجی کارخانوں میں مزدوروں کی ماہانہ آمدنی تین روپے تھی۔ (۲۴)

ہندوستان کے برطانوی قبضے میں چلے جانے اور ان علاقوں (جو بعد میں پاکستان میں شامل ہوئے) کے سستی برطانوی مصنوعات کی منڈیوں میں تبدیل ہو جانے سے مقامی کارخانوں کو زبردست نقصان اٹھانا پڑا۔ بیشتر کارخانے برطانوی مصنوعات کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتے تھے اس لیے وہ بند ہوئے اور ان میں کام کرنے والے ہزاروں ہنرمند کاریگر بے روزگار ہو گئے (۲۵)۔ جیسا کہ ہم بعد میں دیکھیں گے کہ یہی بے روزگار ہنرمند کاریگر انیسویں صدی کے وسط میں سندھ اور پنجاب اور کچھ عرصے بعد سرحد اور بلوچستان میں برطانوی سرمایہ کاری کے نتیجے میں وجود میں آنے والی پرولتاریہ کے پہلے جتھوں میں شامل ہوئے۔

مقبوضاتی نظام کا قیام اور پرولتاریہ کی پیدائش

موجودہ پاکستان میں شامل علاقوں میں یورپی کالونی گیروں کی دلچسپی کافی پرانی تھی۔ سندھ کے مادی مسائل کے جائزے اور تجارتی تعلقات کے قیام کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کا پہلا وفد ۱۶۱۳ء میں ٹھٹھہ پہنچا۔ (۲۶) ۱۶۳۵ء میں انگریزوں

نے یہاں پہلی فیکٹری لگائی۔ اس فیکٹری کا کام سندھی اور پنجابی دست کاروں کی مصنوعات کی خرید اور اسے انگلستان اور دوسرے ہمسایہ مشرقی ممالک کو برآمد کرنا تھا، لیکن فیکٹری کی انتظامیہ کے کھلے استحصال اور دوسرے جبری اقدامات نے مقامی آبادی کو اس کا بائیکاٹ کرنے پر مجبور کر دیا۔ ۱۶۶۲ء میں فیکٹری بند ہو گئی اور اٹھارویں صدی کے آغاز تک برطانیہ سے سندھ کے تجارتی رشتے ختم ہو کر رہ گئے۔ (۲۷) اٹھارویں صدی کے آغاز میں برطانوی حکومت کی مدد سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے مغل شہنشاہ سے یہاں نئی فیکٹری کھولنے اور بعض دوسری مراعات کے بارے میں فرمان حاصل کر لیا۔ ۱۷۷۵ء سے انگریز تاجروں نے اپنی سستی مصنوعات سے مقامی منڈی کو ہندوستانی اشیأ کے لیے محدود کر دیا جس کے نتیجے میں مقامی آبادی میں شدید بے چینی کے پیش نظر حکومت کو سندھ میں درآمد شدہ اشیاء پر محصول لگانا پڑا جس کی وجہ سے یہ تجارت پھر سے بند ہو گئی لیکن ۱۷۸۳ء میں تالپوروں کے اقتدار میں آنے کے بعد کمپنی کے تجارتی رشتے پھر سے بحال ہو گئے۔ سندھی حکمرانوں نے کمپنی کے حکمرانوں سے معاہدہ کیا کہ فرانسیسیوں کو سندھ میں داخل نہیں ہونے دیا جائے گا۔ (۲۶) ۱۸۱۳ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے ہندوستان سے تجارت پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی اجارہ داری ختم کر دی اور آزادانہ تجارت کو فروغ ملا۔ صرف ۱۵، سالوں میں (۱۸۲۸ء۔ ۱۸۱۳ء) اس آزادانہ تجارت کے نتیجے میں انگلستان سے ٹیکسٹائل کے مصنوعات کی درآمد تین گنا بڑھ گئی۔ سندھ میں برطانوی مصنوعات کے درآنے سے مقامی مصنوعات کی مانگ میں ہر سال کمی واقع ہونے لگی۔ ٹیکسٹائل مصنوعات کے بدلے میں برطانوی جہاز واپسی پر یہاں سے شکر، کپاس، چمڑہ اور ریمندہ لے جاتے (۲۸) اس طرح رفتہ رفتہ سندھ برطانوی مصنوعات کی کھپت کی منڈی اور برطانوی صنعت کے لیے سستے خام

مال کی فراہمی کا ذریعہ بن گیا۔

بعض انگریز ماہرین نے اپنی حکومت کو مشورہ دیا کہ دریائے سندھ میں جہاز رانی کرنے سے برطانوی تجارت کو بہت مدد ملے گی۔(۲۹) پنجاب اور سندھ کے برطانوی مقبوضات میں تبدیل ہو جانے سے اسے مشرق وسطیٰ میں اپنے توسیع پسندانہ عزائم کو عملی جامہ پہنانے میں مزید تقویت ملی۔ ۱۸۳۲ء اور ۱۸۴۳ء کے درمیان انگریزوں نے سندھی امراء کے ساتھ یکے بعد دیگرے ایسے چھ معاہدے کیے جن سے سندھ اپنی خود مختاری کھو بیٹھا۔ دریائے سندھ میں فیروز پور سے لے کر اس کے سمندر میں گرنے تک تمام علاقوں میں برطانوی مصنوعات کو لگان سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔ برطانوی مصنوعات کی یلغار سے متاثرہ دست کاروں اور چھوٹے تاجروں نے نومبر دسمبر ۱۹۳۸ء میں حیدر آباد، کراچی، روہڑی، سکھر اور بہاولپور میں زبردست برطانیہ مخالف تحریک چلائی جس کے نتیجے میں برطانیہ کھلی جارحیت پر اتر آیا اور کراچی، شکارپور، روہڑی اور سکھر پر قبضہ کر لیا۔ فروری ۱۸۴۳ء میں آٹھ ہزار سندھی رضاکاروں نے برطانوی قبضے کے خلاف بغاوت کر دی اور بہت سے انگریزوں کو ہلاک کر دیا (۳۰)۔ سندھ اور برطانیہ کے درمیان لڑائی جون ۱۸۴۳ء تک جاری رہی لیکن زیادہ جدید ہتھیاروں سے مسلح افواج کو سندھیوں کی شجاعت اور دلیری شکست نہ دے سکی۔

برطانیہ کے توسیع پسندانہ منصوبوں میں پنجاب کو ایک اہم مقام حاصل تھا جہاں اسے بے پناہ قدرتی وسائل اور تجارتی راستے دکھائی دیتے تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے انتقال کے بعد پنجاب کی جاگیردار ریاستوں کے درمیان کشمکش نے پھر زور پکڑ لیا جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ۱۸۴۵ء میں برطانوی افواج نے سرحدی جھڑپیں شروع کر دیں جو جلد ہی جنگ میں بدل گئیں۔ ۱۸۴۸ء میں گجرات

کے پاس سکھ افواج کی شکست کے بعد پنجاب برطانوی قبضے میں چلا گیا۔

پنجاب اور سندھ کے برطانوی مقبوضات میں تبدیل ہونے کے بعد یہاں کی درآمدات میں زبردست اضافہ ہوا۔ صرف ۱۸۵۷ء-۱۸۴۸ء کے درمیان میں سندھ میں برطانوی مصنوعات کی درآمد تین گنا اور پنجاب میں دوگنا بڑھ گئی۔ (۲۹) پنجاب اور سندھ کے درمیان نقل وحمل کے ذرائع کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے چھٹی دہائی میں مختلف منصوبوں پر کام شروع ہوا۔ ۱۸۵۷ء میں کراچی اور ملتان کے درمیان جہاز رانی کا سلسلہ شروع کیا گیا جبکہ ۱۸۶۱ء میں کراچی اور روہڑی کے درمیان سو میل لمبی ریلوے لائن بچھائی گئی۔ ریلوے لائن کی تعمیر نے نہ صرف سندھ کے نوآبادیاتی استحصال میں اضافہ کیا بلکہ اس کے بطن سے مقامی پرولتاریہ کے ابتدائی جتھوں نے بھی جنم لیا۔ انیسویں صدی کے وسط سے پنجاب اور سندھ کو انگلستان کی صنعت کے لیے خام مال مہیّا کرنے کی منڈی میں بدل دیا گیا۔ اس دو طرفہ تجارت سے نہ صرف برطانوی تاجر خوشحال ہوئے بلکہ مقامی تاجروں کو بھی اس لوٹ کھسوٹ میں حصّہ ملا۔ جبکہ سندھ اور پنجاب کے ہزاروں دست کار (خصوصاً پارچہ باف) کپاس کے مہنگا ہونے یا بالکل غائب ہوجانے سے مسلسل بے روزگاروں کی صفوں میں شامل ہوتے رہے۔ نوآبادکاری نظام کے استحصال کی زد میں کسان بھی آتے ہیں جو آبادی کا زیادہ وسیع حصہ تھا۔ پنجاب اور سندھ کو فتح کرنے کے بعد انگریزوں نے یہاں پر رائج زمین پر مالیے کے نظام کو یکسر بدل ڈالا اور یہاں پر مالی لگان کا نظام متعارف کروایا جو اس سے قبل رائج اجناس کی شکل میں مالیہ ادا کرنے سے کہیں پیچیدہ تھا۔ اس مالی لگان کی رقم اس قدر زیادہ تھی کہ کاشتکار کے پاس سالانہ آمدنی کا بمشکل ۱/۱۱ حصّہ بچتا تھا اور خشک سالی میں تو فصل کے علاوہ ساہوکار کے پاس زمین رہن رکھوا کر سود پر قرض بھی لینا پڑتا۔ (۳۱) مالیے کے

بڑھنے سے کسانوں میں سخت بے چینی پھیل گئی۔ ۱۸۵۱ء، ۴ ۔۵ ۔ ۱۸۵۳ء میں حیدرآباد اور شکارپور کے اضلاع میں ۱۸۵۶ء میں پنجاب کے مختلف اضلاع میں کسانوں کی خودرو تحریکوں نے کئی بار جنم لیا۔ مئی، جون ۱۸۵۷ء میں میرٹھ کے سپاہیوں کی بغاوت کے زیر اثر ہندوستان کے شمال مغربی علاقوں میں بھی فرنگی راج کے خلاف بڑے پیمانے کی تحریک نے جنم لیا۔ البتہ پنجاب میں کسانوں اور شہری آبادی نے اس بغاوت میں موثر حصہ نہیں لیا۔ (۳۲) سندھ میں جہاں نوآبادکاری نظام کا استحصال زیادہ شدید تھا۔ ۵۹ - ۱۹۵۷ء کی بغاوت نے عوامی رنگ اختیار کیا اور سپاہیوں کے ساتھ کسانوں اور شہری محنت کشوں نے بھی تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔ (۲۹) لیکن باغیوں کے پاس کوئی مرکزی قیادت نہ تھی، اسلحہ کی کمی تھی اور تحریک کی قیادت کرنے والے جاگیردار اور قبائیلی سردار عوام کے بڑھتے ہوئے جوش و خروش سے خوفزدہ تھے اس لیے بغاوت کامیاب نہ ہو سکی۔ ۱۸۵۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی سے ہندوستان کا انتظام براہ راست تاج برطانیہ کے زیر تحت آگیا۔

مہاجنوں کو قرض ادا نہ کر سکنے پر کسان اپنی زمین بیچنے پر مجبور ہوتے اور دیہی مزدوروں کی صفوں میں شامل ہو جاتے۔ اس طرح لگان کے مالی نظام کے رائج ہونے سے ایک طرف تو کاشت کاری تجارتی بنیادوں پر استوار ہونا شروع ہوئی۔ اور زمین چند بڑے جاگیرداروں، سوداگروں اور مہاجنوں کے ہاتھوں میں مرتکز ہونے لگی تو دوسری طرف سندھ اور پنجاب میں سرمایہ دارانہ رشتوں کے غیر ترقی یافتہ ہونے سے دیہی آبادی کی مستقل نقل و مکانی کا مسئلہ پیدا ہوا۔ اس طرح دیہی برادری میں بے زمین کسانوں کی تعداد میں اضافہ ہونے سے اس کی ٹوٹ پھوٹ کا عمل اپنے اختتام کو پہنچا اور انیسویں صدی کی ساتویں دھائی میں ان علاقوں میں سرمایہ دارانہ رشتوں کا قیام عمل میں آنا شروع ہوا اور دیہی پرولتاریہ کے پہلے جتھوں نے جنم لیا

لیکن دیہی معاشرے میں سرمایہ دارانہ رشتوں کے قیام کا یہ عمل انتہائی سست اور تکلیف دہ تھا۔

امریکہ میں خانہ جنگی کے آغاز سے برطانیہ کو امریکی کپاس کی برآمد محدود ہو کر رہ گئی جس سے ہندوستانی کپاس کی مانگ میں زبردست اضافہ ہوا اور حکام نے ریلوے لائن بچھانے کے منصوبوں پر عملدرآمد تیز کر دیا۔ گذشتہ صدی کی ساتویں دھائی میں امرتسر لاہور اور ملتان بھی آپس میں جڑ گئے جنھیں بعد میں ریلوے لائن سے حیدرآباد سے جوڑ دیا گیا۔ ریلوے لائن کے ذریعے رابطے نے نہ صرف پنجاب اور سندھ کے علاقوں کو ایک دوسرے سے قریب کیا بلکہ انھیں عالمی منڈی سے جوڑ دیا گیا لیکن محنت کش عوام کی حالت مزید ابتر ہو گئی۔ الٹا ریلوے لائن پر خرچ ہونے والی رقم بھی مقامی آبادی ہی سے وصول کی جاتی۔ برطانوی حکومت نے اس پر ایک شلنگ بھی خرچ نہیں کیا۔ (۳۳) ۱۸۸۱ء میں مارکس لکھتا ہے کہ اگر صرف انھی اشیاء کی قیمت کی بات کی جائے جو تحائف کی شکل میں ہر سال برطانیہ پہنچتی ہیں تو یہ رقم ۶۰ ملین دیہی اور صنعتی محنت کشوں کی سالانہ اوسط آمدنی کے برابر ہیں۔ (۳۴) ۱۸۶۹ء میں سوئیز کنال کے کھلنے سے برطانوی درآمدات اور برآمدات کو نئی طاقت ملی جس کے نتیجے میں صرف ۱۸۷۰ء۔ ۱۸۸۸ء کے دوران سندھ میں ۲۵ ہزار اور پنجاب میں ۶۰ ہزار پارچہ بافی کی کھڈیوں نے پیداوار بند کر دی، ریلوے کی تعمیر نے ہزاروں کشتی بانوں قلیوں اور گلہ بانوں کو روزی سے محروم کر دیا۔ ہزاروں کی تعداد میں افلاس زدہ دستکاروں اور مزدوروں کو مجبوراً دوبارہ دیہات لوٹنا پڑا جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ برطانوی حکومت نے موجودہ پاکستان میں شامل علاقوں کی پیداواری قوتوں کی ترقی میں بڑی رکاوٹ کھڑی کر دی۔

ریلوے لائن کی تعمیر پر سخت محنت کا معاوضہ ۱۰-۸ روپے ماہانہ سے

زائد نہ تھا جس سے نہ صرف خاندان کی کفالت ناممکن تھی بلکہ مزدور کو بھی پورا کھانا بھی میسر نہ ہوتا تھا۔ بنیادی رہائشی سہولتوں اور طبّی اِمداد کا فقدان محنت کشوں کے درمیان مختلف بیماریوں کے پھیلنے کا سبب بنا۔ دیہی علاقوں سے نقل مکانی کرنے والے سرمایہ دار اداروں میں اس غیرانسانی استحصال کو برداشت نہ کرپاتے اور واپس لوٹ جاتے جبکہ وہ دست کار جو نجی کارخانوں میں اس استحصال کا تجربہ رکھتے مستقل مزدوروں میں تبدیل ہونے لگے۔ ریلوے لائن کی تعمیر کے ابتدائی سالوں میں تقریباً تمام کاریگروں کو بمبئی، بنگال، بہار حتیٰ کہ انگلستان تک سے لایا جاتا جبکہ مقامی مزدور محض اوپر کے کام کرتے۔

پنجاب اور سندھ میں کاشت کی جانے والی کپاس کی کوالٹی زیادہ اچھی نہ تھی اور بیرونی منڈیوں میں اسے کامیاب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ۱۸۵۵ء میں پہلی مرتبہ ایسے تجرباتی فارم قائم کیے گئے جن میں امریکی بیج کو آزمایا گیا۔ ایسے تمام فارم میں اجرتی محنت کا رواج تھا کیونکہ سندھ اور پنجاب میں زراعت کلی طور پر مصنوعی آب رسانی پر قائم تھی اِس لیے برطانوی حکومت نے پرانی نہروں کے ساتھ ساتھ نئی نہریں بھی کھدوانی شروع کیں۔ یہ نہریں کھودنے والے زمینوں سے بے دخل کیے جانے والے کسان تھے جن کی محنت کو نہایت سستے داموں خریدا جاتا۔ ریاستی ذرائع کے مطابق آب پاشی کے ان منصوبوں کی تعمیر میں سندھ کے بارہ ہزار اور پنجاب کے ۳۴ ہزار مزدوروں نے حِصّہ لیا۔ (۳۵) آبپاشی کے نظام کی تعمیر میں حاصل ہونے والی اجرت دیہی محنت کشوں کی اجرتوں سے نسبتاً زیادہ تھی۔ نہروں کی کھدائی کرنے پر دن میں ساڑھے چار آنے حاصل ہوتے تھے۔ جبکہ دیہی مزدور کو صرف ۳ آنے حاصل ہوتے تھے۔ (۳۶)

فرنگیوں کی نظر میں نئی زمینوں کا استعمال برطانوی صنعت کے لیے کپاس

کی فراہمی کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کر سکتا تھا اور اس سے ہندوستان کی دیہی آبادی میں بھی طبقاتی کشمکش کی شدت کو کم کرنے میں مدد ملتی لیکن ۱۸۷۰ اور ۱۸۸۰ء کے درمیان خشک سالی اور قحط سے خود دہقان بغاوتوں نے ہندوستان کے تمام علاقوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ۱۸۸۰ - ۸۹ء کے دوران کسانوں کو جبراً پنجاب کے میدانی علاقوں میں منتقل کر دیا گیا۔ رسمی طور پر تو انھیں زمین کا مالک بتایا گیا لیکن حقیقت میں ان کی حیثیت غلاموں سے بھی بدتر تھی۔ وہ صرف برآمدی اجناس ہی کاشت کر سکتے تھے جن کی قیمتِ خرید نہایت کم مقرر کی جاتی اور انھیں زمین اور پانی کے استعمال پر بھاری لگان ادا کرنا پڑتا۔ حکام کی اجازت کے کے بغیر وہ اپنی رہائش تبدیل کرنے کے مجاز نہ تھے۔ ان علاقوں میں بے زمین کاشت کاروں کی محنت کے استحصال کے ذریعے یہاں لائل پور جیسے شہر بسائے گئے۔

ان تمام اقدامات کا نتیجہ یہ نکلا کہ آہستہ آہستہ انگلستان کو خام مال کی برآمد وہاں سے برطانوی مصنوعات کی درآمد سے تجاوز کرنے لگی جس سے مقامی خام مال کی قیمتوں میں زبردست اضافہ ہوا۔ نوآبادیاتی حکام ایسی صنعتیں لگانے میں چنداں دلچسپی نہیں رکھتے تھے جن میں بے روزگار افراد کو کھپایا جا سکتا۔ اسی لیے پنجاب اور سندھ میں سرمایہ دارانہ پیداوار کا آغاز سب سے پہلے نقل و حمل کے ذرائع اور آبپاشی کے نظام کی تعمیر سے ہوا۔

سندھ اور پنجاب پر قبضہ کرنے کے بعد برطانوی حکام کو سرحد اور بلوچستان کے علاقوں پر قبضہ کرنے کی فکر ستانے لگی، لیکن بلوچ عوام کی بھرپور جدوجہد نے انیسویں صدی کی آٹھویں دہائی تک برطانوی افواج کو قابض نہیں ہونے دیا۔ سندھ اور پنجاب میں ریلوے نظام کی تعمیر کے بعد کوئلے کی مانگ میں تیزی سے اضافہ ہوا۔

جس کی کانیں زیادہ تر بلوچستان ہی میں واقع تھیں۔ اس کے علاوہ یہاں لوہے تانبے اور بعض دوسری معدنی اشیاء کے ذخائر بھی موجود تھے۔ ۱۸۷۹ء میں انگریزوں نے ننگی جارحیت کا ارتکاب کرتے ہوئے بلوچستان پر قبضہ کر لیا۔ فرنگیوں نے یہاں بھی پنجاب اور سندھ کی طرح مالی لگان کا جبر نافذ کر دیا۔ ۱۸۸۲ء-۱۸۹۵ کے درمیان صرف کوئٹہ کے علاقے سے وصول کیے جانے والے لگان میں ۳۵۰ فیصد اضافہ ہوا (۲)۔ بلوچستان میں بھی آب پاشی کے نظام کو ترقی دینے کے لیے اقدامات اٹھائے گئے۔ استعماری حکمران ریوڑوں کو چراگاہ میں چرانے اور چھوٹے پیمانے کی دست کاری کی کارگاہوں سے بھی محصول وصول کرنے لگے۔ ۱۸۹۸ء میں سبی اور قلات کے کسانوں کا ½ حصّہ محصول ادا کرنے کی طاقت نہ رکھتا تھا اس لیے وہ اپنی زمین بیچنے پر مجبور ہوا اور زرعی مزدوروں کی صف میں شامل ہو گیا (۳۷)۔ برطانوی صنعتی مصنوعات کی منڈی میں یلغار نے بلوچستان کی دست کاری کی صنعت کو کو سخت متاثر کیا جو زیادہ تر ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے آئے ہوئے مہاجروں کے قبضے میں تھی۔ انیسویں صدی کے اختتام تک برطانوی مال کی درآمد میں چھ گنا اضافہ ہوا۔ مقامی اشیاء کی مانگ میں کمی سے ہزاروں دست کار تباہ ہو گئے۔ ان بے روزگار افراد کے ایک حصّے کو آبپاشی کے منصوبوں، معدنی اشیاء کے حصول اور تعمیرات (خصوصاً ریلوے) میں کھپانے کا انتظام کیا گیا۔ اس طرح گذشتہ صدی کے اختتام پر بلوچستان میں پرولتاریہ کے پہلے دستوں نے جنم لیا۔ برطانوی حکام نے پرانی کانوں کو وسیع کرتے ہوئے بعض نئی کانیں کھودنی شروع کیں جس کے نتیجے میں کوئلے کی پیداوار ۸۰ گنا بڑھ گئی۔ خاقان کے مقام پر تیل کا کنواں بھی کھودا گیا (۲۷)۔

پشتون قبائل میں بھی زیادہ تر دست کار ہندوستان کے دوسرے حصّوں سے

آئے ہوئے مہاجروں سے تعلق رکھتے تھے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدیوں کے درمیان یہاں بھی شہروں کے اور دیگر منڈیاں قائم ہونے لگیں۔ اس عرصے میں شہری آبادی میں اضافہ ہوا اور کپڑے، زیورات، مٹی کے برتن اور زرعی اوزاروں کی کارگاہیں نمودار ہونے لگیں۔ اسی دوران زراعت اور دست کاری کی علیحدگی کا عمل شروع ہوا اور پیسے واجناس بجارت کے رشتے دور دراز کے دیہات تک پھیل گئے۔ کالونی گیروں نے کسانوں سے زمینوں پر مالی لگان وصول کرنا شروع کر دیا اور جنگلات چراگاہوں اور قبائل کی زمینوں کے بڑے حصے کو ریاستی ملکیت قرار دیا گیا۔ زمینوں کو مہیا کیا جانے والے پانی پر بھی لگان وصول کیا جانے لگا (۳۸) برطانوی حکام کی جانب سے محصولات کی یلغار نے چھوٹے کاشتکاروں کو کنگال کرتے ہوئے بڑے جاگیرداروں اور سوداگروں کی مالی حیثیت مضبوط کر دی۔ صرف ۱۸۰۵ - ۱۸۵۵ء کے درمیان انتظامی علاقوں کے ۲۰ فیصد کسان جو محصول ادا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے اپنی زمینیں بیچنے پر مجبور ہوئے اور یا تو مزارعوں میں تبدیل ہو گئے یا سندھ اور پنجاب ہجرت کر گئے جہاں وہ ریلوے لائنوں کے بچھانے اور آب پاشی کے نظام کی تعمیر میں حصہ لینے لگے۔ انتظامی علاقوں میں اقتدار کو مستحکم کرنے کے بعد انگریز حکمران آزاد قبائل پر قبضہ کرنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ نئے علاقوں کے الحاق سے برطانوی ٹیکسٹائل کی مصنوعات کی درآمدات تیزی سے بڑھنے لگیں۔ ان مصنوعات نے مقامی دستکاروں کے ایک حصے کو تو بیرونی کمپنیوں کے ایجنٹ بننے پر مجبور کر دیا جب کہ زیادہ تر افراد بے روزگار ہو گئے۔ (۳۹) پشتون علاقوں کی سستی قوت محنت سب سے پہلے سڑکوں، فوجی تنصیبات کی تعمیر اور معدنی ذخائر کی تلاش میں استعمال ہونا شروع ہوئی۔ انیسویں صدی کی نوئیں دھائی میں پشاور، مردان اور بنوں میں شکر اور وزیرستان اور ڈیرہ اسماعیل

خان میں ٹیکسٹائل کی مصنوعات کی پیداوار کے کارخانوں میں اجرتی مزدوروں کا استعمال ہونے لگا۔ (۴۰)

اس طرح موجودہ پاکستان میں شامل علاقوں میں انگریز کالونی گیر سیاسی جبر کے آلے کو استعمال کرتے ہوئے یہاں کی خودمختار سماجی و معاشی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنے اور یہاں پر موجود ما قبل سرمایہ دارانہ پیداواری رشتوں کی قدامت پسندی کے باعث روایتی پیداوار پر کاری ضرب لگاتے ہوئے براہِ راست پیداوار میں مصروف افراد کی تباہی کا سبب بنے۔ ان علاقوں میں گماشتہ سرمایہ دار طبقے کا کردار ان لوگوں نے ادا کیا جو ہندوستان کے دوسرے حصوں سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے جن میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی مختلف تجارتی اور ساہوکاری ذاتیں اور پارسی شامل تھے۔ اس کاروبار سے سرمایہ جمع کرتے ہوئے انیسویں صدی کی آٹھویں اور نویں دہائیوں میں یہ افراد پنجاب اور سندھ میں چھوٹے چھوٹے کارخانے قائم کرنے لگے۔ پنجاب اور سندھ کے مقامی تاجران مہاجروں سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے۔ اس لیے ان میں سے کچھ تو اپنے سرمائے سے زمین خریدنے لگے اور کچھ ایران، مشرقِ وسطیٰ، مشرقی افریقہ، برما اور ملایا میں کاروبار کرنے لگے اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ پاکستان کے علاقوں میں کارخانوں اور صنعتی بورژوازی کا قیام ہندوستان کے بعض دوسرے علاقوں کے مقابلے میں دیر سے عمل پذیر ہوا۔ (۲) موجودہ پاکستان کے علاقوں میں صنعتی پرولتاریہ کے پہلے جتھوں کا جنم انیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں ہوا۔ جبکہ احمد آباد اور بمبئی میں یہ عمل بیس سال قبل شروع ہوا تھا۔

انیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں موجودہ پاکستان کے علاقوں میں پارچہ بافی، قالین، لوہے، چمڑے، برتنوں، تمباکو وغیرہ کی مصنوعات، روئی کے اوٹنے، شکر، سلک، نمدے اور گندم پیسنے کے ۲۰۰۰ سے زائد چھوٹے کارخانے

موجود تھے جن میں ۲۰ سے زائد افراد کام کرتے تھے۔ لیکن ان تمام کارخانوں کی نمایاں خصوصیت مشینوں کی عدم موجودگی تھی (۴۱) آٹھویں دھائی کے اختتام تک پنجاب میں سرمایہ دارانہ طرز کے ایسے کارخانے وجود میں آنے لگے جن میں مشینیں استعمال ہوتی تھیں۔ یہ کارخانے عموماً کپاس کے بیوپاریوں اور بڑے تاجروں کی ملکیت تھے۔ اس طرح لاہور میں ۱۸۷۷ء کو کپڑے کا پہلا کارخانہ قائم ہوا جس کا مالک رائے بہادر میلا رام تھا۔ کچھ عرصہ بعد ملتان حیدرآباد اوکاڑہ اور لائل پور میں بھی روئی کی صفائی کے کارخانے قائم ہوئے جن میں بھاپ اور ڈیزل انجن استعمال ہوتے تھے۔ (۴۲) انیسویں صدی کے اختتام تک برطانوی کارخانہ دار بھی مقامی صنعت میں سرمایہ لگانے لگے۔ یہ وہی وقت تھا جب برطانیہ میں اجارہ دار سرمایہ داری آزاد مقابلے کی جگہ لے رہی تھی۔ برطانیہ کی بڑی بڑی اجارہ دار کمپنیوں نے ابتدا میں آب پاشی کے نظام اور ریلوے کی تعمیر میں اپنا سرمایہ لگایا۔ برطانوی سرمائے کی آمد نے معروضی طور پر یہاں سرمایہ دارانہ طرز پیداوار اور صنعتی پرولتاریہ کے قیام کے عمل کو تیز کیا اور مقامی تاجروں کی سرگرمیوں کو وسیع کرنے میں مدد دی۔ پنجاب میں سب سے زیادہ اہمیت کپاس کی ابتدائی تیاری کو دی گئی جس کے کارخانوں کی تعداد ۱۹۰۴ء تک ۱۱۴ کے عدد کو چھو رہی تھی (۴۳) جبکہ ۱۹۰۸ء تک صنعتی مزدوروں کی تعداد ۲۵ ہزار سے تجاوز کر چکی تھی۔ (۴۴) سندھ اور پنجاب میں صنعتی کارخانوں کا قیام بڑی حد تک یہاں پر ہنرمند کاریگروں کی موجودگی کا مرہونِ منت تھا جو یہاں پر انگریزوں کے قبضے کے بعد بے روزگار ہونے والے دستکار اور مقامی کارخانوں کے مزدوروں پر مشتمل تھے۔ صنعتی پرولتاریہ نے انھی کے بطن سے جنم لیا۔

کارخانوں میں کام کرنے کے لیے مزدوروں کا انتخاب عموماً جابروں Jobber کے سپرد تھا جو کام دلانے کے صلے میں مزدوروں سے ایک مخصوص رقم وصول کرتے

جابر کے بعد مزدور ماسٹر کے ہتھے چڑھتا جسے ماہانہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ ادا کرنا ہوتا لیکن مزدور کا اصل استحصال کرنے والے کارخانے کے مالکان تھے۔

یورپی مصنوعات سے مقابلے اور اونچے منافع کے لالچ میں مقامی مالکان مزدور سے ۱۶-۱۵ گھنٹے کام لیتے اور ساتھ ہی خواتین کی سستی محنت کو بھی استعمال کرتے۔ ۱۸۹۲ء میں کارخانوں میں ہونے والے معائنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے شمال مشرقی علاقوں میں اجرتیں سب سے نیچی تھیں۔ ٹیکسٹائل مزدور کی اجرت ۱۰-۸ روپے روئی کے کارخانے میں ۵ روپے، ریلوے کے کارخانے میں ۱۵-۸ روپے اور ہنرمند کاریگر ۲۵-۲۰ روپے حاصل کرتا تھا۔ (۴۴) اس شدید ترین استحصال کے نتیجے میں مقامی سرمایہ دار اپنے برطانوی حریفوں کے مقابلے میں بہتر پوزیشن میں آگئے جس سے برطانوی حکمرانوں کو سخت پریشانی لاحق تھی۔ برطانوی سرمایہ کاروں نے پارلیمنٹ میں اپنے نمائندوں کے ذریعے ہندوستان میں لیبر قوانین کے نفاذ کا مطالبہ کرنا شروع کیا۔ ان مطالبات کے نتیجے میں ۱۸۷۵ء میں پہلی مرتبہ ہندوستانی کارخانوں پر ایک کمیٹی بنائی گئی جس کی سفارشات پر ۱۸۸۱ء میں پہلا فیکٹری قانون نافذ کیا گیا۔ (۴۵) یہ قانون بنیادی طور پر بچوں کی محنت کے بارے میں تھے اور اس کا اطلاق صرف ان کارخانوں پر ہوتا تھا جن میں مشینیں استعمال ہوتی ہوں اور سو سے زیادہ کاریگر برسر کار ہوں۔ سات سال سے کم عمر بچوں سے محنت لینے پر پابندی کر دی گئی جب کہ ۱۲-۷ سال تک کے بچے صرف ۹ گھنٹے کام کر سکتے تھے۔ گیارہ سال بعد ۱۸۹۲ء میں بالآخر تمام مزدوروں کے لیے ہفتے میں ایک دن کی چھٹی لازمی قرار دی گئی اور بچوں کے لیے دن میں سات گھنٹے اور خواتین کے لیے ۱۱ گھنٹہ کا وقت مقرر کیا گیا، لیکن ان تمام قوانین کا عملاً نفاذ نہ ہونے کے برابر تھا اور مزدور بغیر کسی چھٹی کے ۱۴-۱۵ گھنٹے کام کرنے پر مجبور تھے۔ ۱۸۹۲ء میں اس قانون کا نفاذ ۵۰ افراد پر

پر مشتمل کارخانے پر بھی ہونے لگا ۔ ۱۹۰۸ء میں مزدور تحریک کے زور پکڑنے سے برطانوی حکمران ہندوستانی صنعتی مزدوروں کے مسائل پر ایک کمیٹی بنانے پر مجبور ہوئے جس کی رپورٹ سے مقامی کارخانوں میں بدترین حالات محنت پر روشنی پڑتی ہے ۔ رپورٹ کے مطابق ٹیکسٹائل کی صنعت میں مزدوروں کا ارتکاز سب سے زیادہ تھا ۔ خواتین کو مردوں کے مقابلے میں ۳۰ فیصد کم تنخواہ ملتی تھی ۔ مزدوروں کے رہائشی حالات ناگفتہ بہ تھے ۔ ان کارخانوں میں بنیادی حفاظتی سہولتیں اور طبی امداد سرے سے ہی موجود نہیں تھیں جس کے نتیجے میں بے شمار مزدور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے

ریلوے نظام کی مزید ترقی اور صنعت کے فروغ سے پنجاب میں ایندھن کی مانگ میں زبردست اضافہ ہوا ۔ کانکنی کی صنعت کو پہلی جنگ عظیم کے دوران بھی کافی ترقی ملی ۔ اسی طرح ۱۹۱۸ء - ۱۹۰۳ء کے درمیان سوتی کپڑے کی پیداوار بھی چھ گنا بڑھ گئی ۔ لیکن پنجاب میں سرمایہ دارانہ طرز پیداوار کی ترقی بڑی حد تک برطانوی منڈی کی ضروریات کو پورا کرتی تھی ۔ اور اسی لیے یک طرفہ اور بدنما کردار کی حامل تھی ۔ دیہات میں سرمایہ دارانہ رشتوں کے در آنے سے یہاں کی زندگی کا روایتی ڈھنگ برقرار نہ رہ سکا اور کسانوں کا استحصال شدید ہوگیا ۔ کسانوں کی زمین سے بے دخلی حد سے تجاوز کرنے لگی ۔ صرف ۱۹۰۴ء میں بے زمین کسانوں کی تعداد دو لاکھ سے زائد تھی ۔ (۴۷)

سندھ میں صنعتی کارخانوں کی تعمیر کی رفتار نسبتاً سست تھی ۔ چالیس سالہ مقبوضاتی عہد میں صرف ۱۳ چھوٹے کارخانوں کا قیام عمل میں آیا (۴۸) دیہات میں تقریباً ۸۰ فیصد زمینوں کی کاشت پٹے پر ہوتی تھی جبکہ ۴۲ فیصد زمین ساہوکاروں کی ملکیت تھی (۴۹) بے زمین کسان بڑے پیمانے پر شہروں کا رخ کرنے لگے ۔ پہلی جنگ عظیم میں سندھ میں بھی کارخانوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا جو ۱۹۱۸ء میں ۴۹ تک پہنچ گئی ۔ شکارپور، سکھر، کراچی اور خیرپور کے مزدوروں میں سرحد اور بلوچستان سے

ہجرت کرنے والے محنت کش بھی موجود تھے۔ سندھ میں دیہی آبادی کی شہروں کو منتقلی کی اونچی شرح کے باعث پنجاب کے مقابلے میں یہاں اجرتیں نسبتاً کم تھیں۔ ۱۹۰۸ء میں ایک مزدور خاندان کی کم سے کم ضروریات کی تکمیل کے لیے ۲۵۔۳۰ روپے ماہانہ کی ضرورت تھی جبکہ اسی عرصے میں ایک مزدور کی اوسط آمدنی ۵ سے ۱۲ روپے ماہانہ تھی (۴۶) محنت کے سنگین حالات اور اجرت کا قدرے کم ہونا سندھ میں صنعتی پرولتاریہ کے بڑھنے کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ تھے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں بلوچستان میں بھی صنعتی کارخانے قائم ہونے لگے۔ لیکن یہاں پر صرف چند مخصوص شعبوں کو ترقی دی گئی جن میں زرعی اشیاء کی تیاری معدنی اشیاء کا حصول اور ریلوے اور آب پاشی کے نظام کی تعمیر شامل تھے۔ بلوچ پرولتاریہ کے بارے میں بات کرتے ہوئے یہ ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ صوبے میں سرمایہ دارانہ رشتوں کے غیر ترقی یافتہ ہونے کے باعث بے زمین کاشتکار اور بے روزگار دستکار پنجاب، سندھ، بمبئی اور ہندوستان کے زیادہ ترقی یافتہ علاقوں کو ہجرت کر جاتے۔

گزشتہ صدی کے اختتام تک برطانوی کالونی گیر صوبہ سرحد کی منڈیوں پر بھی قبضہ کر چکے تھے۔ ۱۹۰۳ سے ۱۹۱۱ء کے درمیان چھوٹے مالکان زمین کی ۱۵ فیصد جائیداد بڑے جاگیرداروں کے ہاتھ میں آ چکی تھی اور شہری بے روزگاروں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا۔ صوبہ سرحد کے علاقوں کو زرعی خام مال مہیا کرنے کے علاقوں کی سطح پر محدود رکھنے کی خاطر یہاں صنعتی کارخانوں کے قیام سے گریز کیا گیا لیکن رفتہ رفتہ مقامی تجارتی بورژوازی نے یہاں ٹیکسٹائل کے کارخانے قائم کرنے شروع کر دیے کیوں کہ یہاں ہنرمند کاریگروں کی کمی تھی اس لیے ان کارخانوں کے مزدور زیادہ تر پنجاب اور بمبئی سے تعلق رکھتے تھے۔

اس طرح اوپر بیان کردہ حقائق سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ گزشتہ صدی

کے اختتام تک موجودہ پاکستان میں شامل علاقوں میں سرمایہ دارانہ پیداوار کا آغاز ہو چکا تھا اور صنعتی پرولتاریہ کے پہلے جتھے وجود میں آچکے تھے اگر ۱۹۰۱ء میں ان علاقوں کی شہری آبادی ۱۷، لاکھ تھی تو ۱۹۲۱ء میں یہ تعداد ۲۱، لاکھ ہو چکی تھی۔

جب ۱۸۹۱ء میں پنجاب اور سندھ کے بہت سے کارخانوں کے مالکان نے مزدوروں کی تنخواہ میں ۲۰ - ۲۵، فیصد کمی کر دی تو لاہور، راولپنڈی اور کراچی میں پہلی خودرو ہڑتالیں شروع ہو گئیں۔ "Times of india" کے مطابق لاہور کی ریلوے ورکشاپ کے مزدوروں کی ۹ مئی ۱۸۹۱ء کی ہڑتال مزدوروں کی فتح پر منتج ہوئی۔ مارکس اور اینگلس لکھتے ہیں کہ "پہلے تو معاشی حالات نے عوام کو مزدوروں کی صفوں میں دھکیلا۔ پھر سرمائے کی حکمرانی نے انھیں ایک ہی جگہ اور سطح پر لا کھڑا کیا اور ان کے مفادات کے مشترک ہونے سے ان مزدوروں نے طبقے کی شکل اختیار کی۔

قومی آزادی کی جدّوجہد اور مزدور تحریک کا آغاز

۹، مئی ۱۸۹۱ء کی ریلوے مزدوروں کی ہڑتال پاکستان کے مزدور طبقے کی پہلی ہڑتال تھی۔ ۹۶-۱۸۹۲ء کے دوران روہڑی، کراچی، سبّی اور جیکب آباد کے ریلوے کے مزدوروں نے مختصر ہڑتالیں کیں جن کا مطالبہ تمام علاقے کے ریلوے مزدوروں کے لیے یکساں تنخواہ اور محنت کے اوقات میں کمی تھی (۵۰) ۱۸۹۷ء سے نسبتاً بڑے ٹیکسٹائل کے کارخانوں، روئی کی صفائی اور آبی ٹرانسپورٹ کے مزدور بھی ہڑتال میں حصّہ لینے لگے جن کا مطالبہ تنخواہ میں اضافہ تھا۔ ۱۸۹۶ء اور ۱۹۰۶ء کے دوران ضروری اشیاء کی قیمتوں میں ۶۱، فیصد اضافہ ہوا۔ جبکہ اوسط آمدنی صرف ایک فیصد بڑھی (۵۱)

پنجاب اور سندھ میں بعض ریڈیکل عناصر نے صنعتی اور ٹرانسپورٹ مزدوروں، کسانوں، سپاہیوں، اور شہری درمیانے طبقے کے درمیان انگریز حکمرانوں کے خلاف

پروپیگنڈہ مہم شروع کی۔ حکام کی جانب سے سخت پابندی کے باوجود ۱۸۹۶ء میں کراچی میں ریلوے، بندرگاہ اور ٹیکسٹائل مزدوروں کی شرکت سے ایک بڑے جلسۂ عام کا اہتمام کیا گیا جس میں ہزاروں افراد شریک تھے۔ ۹۷-۱۸۹۶ء میں خشک سالی کے نتیجے میں ہندوستان کے بہت سے علاقوں میں کال پڑ گیا جس کے ساتھ ہی پلیگ کی وبا پھیلی اور لاکھوں افراد لقمۂ اجل بن گئے۔ ۱۸۹۹ء میں انگریزوں کے خلاف تحریک چلانے کے الزام میں بے شمار افراد کو حراست میں لے لیا گیا اور جبر و تشدد کے نت نئے ہتھکنڈے استعمال ہونے لگے۔

انیسویں صدی کے آخری عشرے میں ایک انگریز پارچہ باف دن میں ۱۰ گھنٹے کام کر کے ۲۵ شلنگ حاصل کرتا تھا جبکہ اس کا ہندوستانی رفیق ۱۴ گھنٹے کام کر کے صرف ۳. شلنگ حاصل کر پاتا تھا۔ (۵۲)

نومبر میں پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان میں انگریزوں کی مصنوعات کے بائیکاٹ کرنے کی مہم کا آغاز ہوا۔ کراچی کی بندرگاہ پر مزدوروں نے بدیشی مال اتارنے سے انکار کر دیا (۵۳)۔ مزدوروں کے تحریک میں حصّہ لینے سے انگریزی حکمران سخت پریشان تھے۔ برطانوی صنعت کاروں کی ایما پر پنجاب کے ۴۰ کارخانوں کے آجروں کی تنظیم کا قیام عمل میں آیا تاکہ مزدوروں کے خلاف متحدہ کارروائی کی جا سکے۔ مئی ۱۹۰۶ء میں ریلوے بندرگاہ اور بڑے ٹیکسٹائل کارخانوں کے مزدوروں کی ہڑتالی جدوجہد میں شدت پیدا ہوئی اور وہ تنخواہ میں اضافے کے ساتھ برطانوی راج کے خاتمے کا بھی مطالبہ کرنے لگے۔ سکھر میں پولیس اور ریلوے مزدوروں کے درمیان جھڑپیں ہوئیں۔ پنجاب میں زمین اور پانی پر لگان میں اضافے کے اعلان کے بعد لاہور، راولپنڈی، اوکاڑہ، لائل پور، سیالکوٹ اور بڑے دیہات میں ہزاروں کسانوں نے مظاہرے اور جلسے منعقد کیے۔ ۱۳، دسمبر کو کراچی کے ٹیکسٹائل مزدوروں نے سندھی

کسانوں کی جدوجہد سے یکجہتی کے اظہار میں تین روزہ ہڑتال کی (۵۰) اور ۲۷ دسمبر کو انگریز افسروں کی کالونی پر دھاوا بول دیا۔ ۱۹۰۷ء کے اوائل میں استعماریت کے خلاف تحریک نے بلوچستان کے شمال کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور بلوچ محبِ وطن فرنگی افواج پر جا بجا حملے کرنے لگے۔ (۲۱)

دسمبر ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ فروری ۱۹۰۷ء میں کراچی، ملتان حیدر آباد اور پشاور میں مسلم کانفرنس کے فیصلوں کے حق میں بہت سے جلسے منعقد کیے گئے۔ اسی سال شکارپور میں ہندو تاجروں اور مسلمان دست کاروں کے درمیان جھڑپ ہوئی جسے انگریزوں نے تمام ذرائع سے ہوا دی۔ (۵۰) انگریزوں کے ہندو مسلم فسادات کو بھڑکانے سے تحریک آزادی، مزدور اور کسان تحریکوں کو شدید نقصان پہنچا جس سے مزدور طبقے کے سیاسی شعور کے بڑھنے کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی ہو گئیں۔

پنجاب میں صورتحال کے بگڑنے کا مسئلہ برطانوی پارلیمنٹ میں زیرِ بحث آیا تو مورلی نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پنجاب میں زمین اور آب رسانی پر محصول کے بڑھنے سے یہاں روسی طریقے سے جواب دینے کی کوشش کی جارہی ہے۔ (۵۴)

۱۹۰۷ء میں راولپنڈی میں بغاوت ہوئی جس کے شرکاء نے سرکاری دفتروں کو نقصان پہنچایا۔ بغاوت کو کچلنے کے لیے وہاں فوج کو بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا، لیکن ریلوے مزدوروں نے ہڑتال کرتے ہوئے فوجیوں کو راولپنڈی منتقل کرنے سے انکار کر دیا (۵۵) ریلوے مزدوروں کی سیاسی ہڑتال نے مختلف علاقوں کے مزدوروں اور کسانوں کے درمیان متحدہ تحریک چلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ کچھ عرصے بعد راولپنڈی کی بغاوت کے ۹۵ سرگرم شرکاء کو گرفتار کر کے برما بھیج دیا گیا۔ ۱۹۰۷ء کی مزدور اور کسانوں کی تحریکوں سے خائف مقامی بورژوازی اور جاگیردار انگریزوں سے مفاہمت کرنے کی

سوچنے لگے۔ ۱۹۰۷ء میں کانگریس کے اجلاس میں لبرل اور جمہوریت پسند عناصر کے درمیان اِس مسئلے پر پھوٹ پڑ گئی۔

پنجاب کے ریڈیکل عناصر نے چترال، دیر اور سوات جیسے دور دراز علاقوں میں بھی سفر کیا اور ان کے درمیان پروپیگنڈہ مہم چلائی۔ ان حقائق کی تصدیق کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ برطانوی راج کے خلاف تحریک جو پہلے صرف بنگال اور پنجاب تک محدود تھی۔ اب شمالی علاقوں میں بھی پھیل رہی ہے (۵۶) چترال اور دیر کے مزدوروں نے یہاں پر زیر تعمیر فوجی تنصیبات پر جبری محنت کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے کام بند کر دیا اور انگریز افسران پر ٹوٹ پڑے (۵۰) اِن علاقوں میں مزید افواج بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا اور پنجاب سے آنے والے بے شمار سرگرم کارکنوں کو گرفتار کر لیا گیا جس پر لاہور کے شہریوں نے سڑکوں پر چار گھنٹوں کا مظاہرہ کیا۔ ۱۹۰۷ء میں بلوچستان کے کانکنوں کی ہڑتال کے نتیجے میں ان کے مطالبات تسلیم کر لیے گئے۔ ۱۹۰۸ء میں برطانوی ہندوستان کے تمام بڑے شہروں کے ٹیلیگراف ملازمین نے طویل ہڑتال کر دی ۱۹۰۸ء ہی میں پریس ایکٹ کے نفاذ کے بعد ترقی پسند رسالے "کسیاری" کے مدیر تیلاک کو گرفتار کر لیا گیا اور چھ سال قید کی سزا دی گئی جس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے بمبئی کے ایک لاکھ مزدوروں نے ہڑتال کر دی۔ شمال مغربی ریلوے کے مزدور بھی اِس احتجاج میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۰۹ء اور ۱۹۱۲ء کے درمیان ہڑتالوں کی تحریک کافی کمزور پڑ گئی جس کی ایک وجہ تو مزدوروں اور آزادی پسندوں پر جبر و تشدد کا بڑھنا تھا اور دوسری طرف مزدوروں کو بعض مراعات بھی دی گئیں۔ مزدور تحریک میں مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد کے درمیان فرقہ وارانہ تعصب کو ہوا دینے سے بھی کافی منفی اثرات مرتب ہوئے۔ ۱۹۰۸ء میں ریلوے میں کام کرنے والے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جھڑپ کروانے میں انگریز ایجنٹوں کا خاصا بڑا حصہ تھا۔

(۵۰) ۱۹۱۲ء میں مزدور تحریک نے پھر زور پکڑا جس کی وجہ فیکٹریوں کا نیا قانون تھا۔ جس نے ۱۸۹۱ء کے قانون کی جگہ لی تھی اور ۱۲ گھنٹے کے اوقات طے کیے تھے، لیکن مزدور بدستور ۱۵۔۱۴، گھنٹے کام کرتے رہے۔

۱۹۱۴ء میں برطانیہ کے پہلی جنگ عظیم میں شامل ہونے اور ہندوستان کو جنگ کا فریق قرار دینے سے مزدور طبقے کی حالت مزید خراب ہوئی۔ جنگ کے سالوں میں برطانوی سامراج نے پاکستانی علاقوں کی افرادی قوت اور مادی وسائل کا بھرپور استعمال کیا۔ پنجاب سندھ اور سرحدوہ علاقے تھے جہاں سے سپاہیوں کا چناؤ ہوتا اور خورد و نوش کی اشیاء سپلائی کی جاتیں۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران یورپ، ایشیا اور افریقہ کے میدانِ جنگ میں ۱۳، لاکھ ہندوستانی سپاہی بھیجے گئے جن کے ایک حصے سے برطانیہ میں فوجی سامان تیار کرنے کے کارخانوں میں کام لیا گیا۔ ان میں سے ۵، لاکھ سپاہی صرف پنجاب سے تعلق رکھتے تھے جب کہ ان افراد پر ہونے والے اخراجات کو ہندوستانی عوام ہی برداشت کرتے جنگ کے زمانے میں محصولات میں ۵۰ فیصد اضافہ ہوگیا۔ پنجاب اور سندھ سے گندم کی پیداوار تقریباً دوگنی ہوگئی جس کے نتیجے میں مقامی منڈیوں میں گندم کی قیمتیں ۶۲ فیصد بڑھ گئیں۔ لیکن محنت کش طبقات کی حقیقی آمدنی میں اضافہ نہ ہونے کے برابر تھا جس سے مزدوروں کی ہڑتالی تحریک نے مزید شدت اختیار کی۔ اکتوبر ۱۹۱۵ء میں کراچی بندرگاہ پر مزدوروں کی ہڑتال نے اپنے رہنماؤں کی گرفتاری پر سیاسی رنگ اختیار کیا اور تمام ہڑتالی سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کرنے کا مطالبہ کرنے لگے۔ جنگ کے تباہ کن اثرات نے پنجاب اور سندھ کے زرعی مزدوروں اور کسانوں کو بھی سخت متاثر کیا۔ اپنی تمام فصل حکومت کے حوالے کرتے ہوئے کسان خود بھی بھوکوں مرتے۔ (۴۴) ان حالات نے کسانوں کو جاگیردار اور استعماریت مخالف تحریکوں میں دھکیل دیا۔ ۱۹۱۵ء کے اوائل میں یہ تحریک پنجاب کے تمام دیہات اور سپاہیوں میں پھیل گئی۔ پنجاب کی انقلابی تنظیم

غدر پارٹی نے کسانوں اور سپاہیوں سے بغاوت کرنے کی اپیل کی (۵۷) فروری ۱۹۱۵ء میں اس تحریک نے زور پکڑا لیکن نوآبادیاتی حکمرانوں نے اسے سختی سے کچل دیا اور غدر پارٹی کے رہنماؤں سمیت لاتعداد سرگرم شرکاء گرفتار کر لیے گئے۔ کپاس کی قیمتوں کے بڑھنے سے مقامی پارچہ بافوں کو بھی کافی نقصان پہنچا جبکہ مقامی بورژروازی نے صورتحال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے افواج کو سپلائی کے ذریعے کافی دولت کمائی۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران ہونے والی ہڑتالوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ ان میں سے بیشتر ہڑتالیں خود رو تھیں اور ان میں اتحاد ناپید تھا البتہ ۱۹۱۷ کے اکتوبر انقلاب کے بعد صورتِ حال تیزی سے بدلی اور یہ تحریک، زیادہ منظم طریقے سے آگے بڑھنے لگی۔

مزدور طبقہ اور مزدور تحریک ۱۹۱۸-۱۹۴۷ء

پہلی جنگ عظیم کے سالوں میں ہندوستان کے شمال مغربی حصوں میں صنعتی ترقی کی رفتار کافی تیز ہوئی بورژروازی اور پرولتاریہ اس عرصے میں تعداد میں بھی بڑھیں اور زیادہ منظم بھی ہوئیں۔ اکتوبر انقلاب کے زیر اثر ۱۹۱۸ء میں ہونے والی ہڑتالوں کی نمایاں خصوصیت انفرادی کارخانوں کی بجائے صنعت کے پورے شعبے سے تعلق رکھنے والے کارخانوں کی مشترکہ ہڑتال تھی (۵۸)، قومی آزادی کی جدوجہد میں مزدور اور کسان طبقات کے فیصلہ کن رول اور اسے منظم کرنے کے بارے میں برطانوی ہندوستان کی ترقی پسند قوتوں نے اکتوبر انقلاب سے اہم سبق حاصل کیا۔

استعماری راج کے خلاف جدوجہد میں ابھار کی ایک وجہ ہندوستان کو جنگ کے خاتمے پر ڈومینین کا درجہ دیا جانے کے برطانوی وعدے سے انحراف تھا۔ ۱۹۱۸-۱۹۱۹ء میں لاہور، راولپنڈی، کراچی اور دوسرے شہروں میں ہڑتالی کمیٹیوں کے قیام کا فیصلہ

کیا گیا جن کی بنیاد پر مزدور اتحاد ابھرنے لگے۔ مارچ ۱۹۱۹ء میں پنجاب اور سندھ کی کی تمام ہڑتالی کمیٹیوں کی راہنمائی میں رویٹ قانون کے خلاف پہلی عام سیاسی ہڑتال ہوئی۔ اس قانون نے تمام جلسوں، مظاہروں، ہڑتالوں وغیرہ پر پابندی عائد کر دی تھی۔ اس ہڑتال کے دوران پولیس اور مظاہرین میں زبردست جھڑپیں ہوئیں پنجاب کے مشہور سیاسی رہنماؤں سیف الدین کچلو اور ستیا پال کو صوبہ بدر کر دیا گیا جس پر احتجاج کرتے ہوئے ۱۰، اپریل کو امرتسر میں ۳۰، ہزار مزدوروں، کسانوں اور دیگر افراد نے عظیم الشان مظاہرہ کیا جس پر فائرنگ کرتے ہوئے ۲۶، افراد کو ہلاک کر دیا گیا۔ (۵۹) شام تک مظاہرین نے ریلوے اسٹیشن، ٹیلیفون و تار کے دفتروں پر قبضہ کر لیا۔ ہلاک ہونے والوں کی تدفین کے بعد جلیانوالہ باغ میں پنجاب کے تمام حصوں سے آئے ہوئے عوام نے ایک جلسہ منعقد کیا جس پر بہیمانہ فائرنگ کرتے ہوئے ڈیڑھ سے دو ہزار افراد کو ہلاک کر دیا گیا۔ اس بے رحم اور سنگین واقعے نے، سندھ، بلوچستان سرحد اور پنجاب سمیت پورے برطانوی ہندوستان میں غم و غصے کی لہر دوڑا دی۔ جن میں مزدور اور کسان پیش پیش تھے۔ گوجرانوالہ میں مظاہرین کو کچلنے کے لیے ہوائی جہاز بھیجے گئے جن کی بمباری سے شہر کے بیشتر صنعتی و تجارتی مراکز اسکول و ہسپتال وغیرہ تباہ و برباد اور سینکڑوں شہری شہید ہو گئے۔ (۶۰) اس زبردست انقلابی ابھار کے دوران صرف تین ماہ میں پاکستان کے علاقوں میں ۸ بڑی ہڑتالیں اور ۲۷، جلسے اور مظاہرے منعقد ہوئے۔

۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۱ کے دوران بمبئی پریزیڈنسی کے مختلف علاقوں میں ڈاک و تار کے ملازمین اور کراچی و سکھر کے ریلوے مزدوروں کی انجمنیں بننے لگیں۔ یہ انجمنیں علاقائی بنیادوں پر فیڈریشن میں متحد ہوئیں۔ ۱۹۱۹ء میں پنجاب کے ریلوے مزدوروں کی عام ہڑتال کے دوران ریلوے مزدوروں کی ٹریڈ یونین کا قیام عمل میں آیا جس میں تین ہزار

مزدور شامل تھے۔ (۵۹) لیکن ریلوے انتظامیہ نے یونین کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس فیصلے کے خلاف عام ہڑتال کے نتیجے میں نہ صرف یونین کو تسلیم کر لیا گیا بلکہ تنخواہوں میں بھی ۱۰۰ - ۴۰ فیصد تک اضافہ کر دیا گیا (۴۴) ریلوے مزدوروں کی اس فتح نے دوسرے شعبوں کے مزدوروں کے حوصلے بلند کر دیے اور وہ اتحاد کے فوائد سے آگاہ ہوئے ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۷ء کے دوران ریلوے مزدوروں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے صنعتی کارخانوں اور بندرگاہ کے مزدوروں نے بھی اپنی تنظیمیں بنانے کا کام شروع کیا، لیکن زیادہ تر صنعتی کارخانوں میں مزدوروں کی تعداد ۴۰۔۱۴۰ - ۱۲۰ افراد سے تجاوز نہیں کرتی تھی اس لیے ان ابتدائی انجمنوں کے اراکین کی تعداد زیادہ نہ تھی ماسوائے ریلوے کے جہاں ۱۹۲۵ء میں تقریباً ایک لاکھ مزدور برسرکار تھے۔ (۶۱) ۱۹۲۶ء میں آبی ٹرانسپورٹ میں ۱۸، ہزار اور کانکنی میں ۱۱، ہزار مزدور مصروف کار تھے۔ (۶۲) ریلوے مزدور نہ صرف تعداد میں زیادہ تھے بلکہ سب سے زیادہ منظم بھی تھے۔ ۱۹۲۵ء میں ریلوے کے ۸۰ فیصد مزدور ٹریڈ یونین کے ممبر تھے جبکہ پنجاب کے صنعتی کارخانوں کے صرف ۲۸ فیصد اور سندھ کے ۳۶ فیصد مزدور ٹریڈ یونین تنظیموں کے رکن تھے۔ (۵۹)

سرحد اور بلوچستان میں زمین کے بڑے جاگیرداروں کے ہاتھوں میں مرتکز ہونے سے اور صنعتی کارخانوں کی عدم موجودگی سے بے زمین کسان مزارع یا زرعی مزدوروں میں تبدیل ہو جاتے۔ صرف چند سالوں میں سرحد کے کسانوں نے ۶۹، ہزار ایکڑ میں بیچ ڈالی جس سے تقریباً دس ہزار کسان خاندان زمین سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

(اگر ایک خاندان میں اوسطاً ۵، افراد شمار کیے جائیں تو پچاس ہزار افراد روزگار سے محروم ہو گئے) یہ تمام لوگ مزارعوں کی مجموعی مانگ سے کہیں زیادہ تھے اس لیے ہندوستان کے دوسرے صنعتی شہروں کو ہجرت کر گئے۔ (۴۰) جس کی تصدیق اس

عرصے میں ہونے والی مردم شماریوں کے آعداد و شمار سے ہوتی ہے جن میں ان علاقوں کی آبادی میں کمی کا رجحان دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً ۱۹۱۱ء میں برطانوی بلوچستان کی آبادی ساڑھے آٹھ لاکھ تھی جو ۱۹۲۱ء میں کم ہوکر پونے آٹھ لاکھ رہ گئی۔ پنجاب اور سندھ کی آبادی کے بڑھنے میں سرحد اور بلوچستان سے آئے ہوئے مہاجروں نے خاصا اہم کردار ادا کیا۔ صرف ۱۹۲۰ء میں لاہور، کراچی، حیدر آباد، ملتان اور سکھر کی پرولتاریہ میں پٹھان اور بلوچ مزدوروں کی تعداد ۶ سے ۷ فیصد تک تھی (۶۳) ان پٹھانوں اور بلوچوں کے بڑے شہروں کی پرولتاریہ سے میل جول کے بڑھنے سے ان کے طبقاتی اور سیاسی شعور کے بڑھنے میں مثبت کردار ادا کیا۔ سرحد میں ریلوے نظام کے آجانے سے یہاں پر بھی مزدوروں کی تعداد میں اضافہ ہوا، لیکن ستم ظریفی یہ تھی کہ ۷۰، سال کے نوآبادیاتی قبضے کے دوران اس علاقے میں ایک بھی صنعتی کارخانہ قائم نہیں کیا گیا جس سے سرحد کی آبادی کے سماجی ڈھانچے کے نوآبادیاتی کردار کا اظہار ہوتا ہے۔

ٹریڈ یونین تحریک کی ترقی اور برطانوی ہندوستان کے مزدور طبقے کی فیصلہ کن جدوجہد نے ان تمام سرگرمیوں کو ملکی سطح پر منظم کرنے کا سوال اٹھایا۔ عالمی تنظیم محنت کے اجلاس میں ہندوستانی وفد کے چناؤ نے فوری ترغیبی عنصر کا کردار ادا کیا جون ۱۹۲۰ء میں بمبئی میں وفد کے چناؤ کے سلسلے میں ہونے والے اجلاس میں انڈین نیشنل کانگریس کی تجویز پر آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کا قیام عمل میں آیا۔ جس کی پہلی کانگریس اسی سال اکتوبر میں بلائی گئی جس میں ۱۰۷، ٹریڈ یونینوں نے حصّہ لیا۔ اس کی مرکزی کمیٹی میں پنجاب اور سندھ کی ٹریڈ یونینیں بھی شامل تھیں۔ ۱۹۲۱ء میں شعبہ جاتی ٹریڈ یونین بنانے کی تحریک کا آغاز ہوا۔ اس عرصے میں ٹیکسٹائل، خورد و نوش کی اشیاء کے کارخانوں اور آبی و شہری ٹرانسپورٹ کی ٹریڈ یونین تنظیمیں متحد ہونا شروع ہوئیں۔ ٹریڈ یونین تحریک کی راہ میں صرف آجروں کا ردِ عمل ہی مشکلات

پیدا نہیں کر رہا تھا بلکہ بعض جگہ مزدور بھی انجمن میں شریک ہونے سے عدم دلچسپی کا اظہار کرتے جس کی وجہ ان تنظیموں میں باہر کے لوگوں کا رہنما ہونا تھا جو مقامی مالکانِ کارخانہ سے سازباز کر کے مزدوروں کے مفادات کو نقصان پہنچاتے۔

۱۹۲۱ء میں قیمتوں کے آسمان کو چھونے سے مزدوروں کی حقیقی آمدنی میں کمی ہوئی۔ نومبر ۱۹۲۱ء میں صوبائی ٹریڈ یونینوں کے مطالبے پر AITVC کی دوسری کانگریس طلب کر لی گئی۔ کانگریس نے معاشی مسائل پر قرارداد منظور کرنے کے علاوہ ہندوستان کو آزادی دینے کا بھی مطالبہ کیا۔

پرولتاریہ کی سیاسی سرگرمیوں نے حکام کو مزدوروں کے مظاہروں اور مطالبات کا ریکارڈ رکھنے پر مجبور کر دیا۔ اس طرح مئی ۱۹۲۱ء سے سندھ اور پنجاب میں ہونے والے صنعتی تنازعات کے بارے میں آعداد و شمار اکٹھے کیے جانے لگے۔ لیبر ڈپارٹمنٹ ۲۴ گھنٹے سے زائد فیکٹری کے بند ہونے اور اس میں ۱۰ اشرکا کی شرکت کو صنعتی تنازعہ شمار کرتا تھا جبکہ لاک آؤٹ اور ہڑتال میں کوئی فرق نہیں سمجھا جاتا تھا۔ (۶۴)

سندھ میں سیاسی بنیادوں پر ہونے والی ہڑتالوں کی تعداد زیادہ تھی۔ مزدور طبقے کی سیاسی سرگرمیوں کے ابھار کا تعلق ہندوستان میں سوشلزم کے نظریات کے پھیلنے، کمیونسٹ گروپوں کے قیام اور نوآبادیاتی نظام کے خلاف جدوجہد سے تھا۔ ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۱ء کے درمیان تحریک خلافت نے بھی عوام کے وسیع حصّے کو تحریک آزادی کی صفوں میں لا کھڑا کیا۔ ۱۹۲۰ء میں سوویت روس میں بسنے والے انقلابیوں نے تاشقند میں پہلا کمیونسٹ گروپ قائم کیا۔ انقلابی لڑائی کے نظریات اور تجربے سے خود آگاہی حاصل کرتے ہوئے یہ لوگ آہستہ آہستہ واپس وطن لوٹنے لگے۔ ان میں سے کچھ تو فوراً گرفتار کر لیے گئے، لیکن بہت سے انقلابی مزدوروں اور

معاشرے کی دوسری مظلوم پرتوں کو منظم کرنے میں مصروف ہوگئے۔ ۱۰، اکتوبر ۱۹۲۱ء میں لاہور میں مزدور نمائندوں کا اجلاس بلایا گیا جس میں مزدور طبقے کی سیاسی جماعت کے قیام کرنے کا سوال زیر بحث آیا۔ ۱۹۲۲ء میں غلام حسین کی زیر ادارت "انقلاب" نامی رسالہ نکالا گیا جس نے انقلابی نظریات کو پھیلانے میں بہت مدد دی۔ (۶۱) اسی سال موجودہ پاکستان کی سرزمین پر پہلا کمیونسٹ گروپ قائم ہوا جس کی قیادت غلام حسین کر رہے تھے۔ اس گروپ نے بمبئی مدراس اور کلکتہ کے گروپوں سے مضبوط رابطہ قائم کر رکھے تھے۔ اسی سال بمبئی میں ڈانگے نے ہفت روزہ "سوشلسٹ" نکالنا شروع کیا۔ یہیں پر کمیونسٹ مینی فیسٹو اور مارکس و لینن کی تصنیفات بھی چھپنا شروع ہوئیں۔ پنجاب میں پہلے کمیونسٹ گروپ کے قیام سے ٹریڈ یونین تحریک کو نظریاتی اور تنظیمی حوالوں سے تقویت ملی۔ مزدور تحریک کے زور پکڑنے سے مقامی بورژوازی بہت خائف تھی۔ ۱۹۲۲ء میں کانگریس کے اجلاس میں گاندھی کی تجویز پر سول نافرمانی کی تحریک کے خاتمے کی قرارداد منظور کرلی گئی۔

۲۵-۱۹۲۴ء کی ہڑتالوں کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ یہ تمام ہڑتالیں ٹریڈ یونین تنظیموں کی قیادت میں ہوئیں اور ہڑتال کے متعلق تمام مسائل پر اراکین کے درمیان بحث و مباحثہ ہوتا۔ اس عرصے کی زیادہ تر ہڑتالیں کسی ایک صنعت کے پورے شعبوں میں ہوتی تھیں۔ ان میں سے سب سے بڑی ہڑتال مارچ ۱۹۲۴ء میں ریلوے مزدوروں کی تھی جس میں اپریل تک ۰ ہزار مزدور شریک ہو چکے تھے۔ یہ ہڑتال جون تک جاری رہی۔ لیکن انتظامیہ نے جب نئے مزدوروں کی بھرتی شروع کردی تو اسے مزید جاری نہ رکھا جا سکا۔

مزدوروں کی زبردست جدوجہد نے حکام کو ۱۹۲۲ء میں قیمتوں پر سرکاری کنٹرول رکھنے پر مجبور کر دیا جس سے مزدوروں کی حقیقی آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ ہوا اور ہڑتالیں بھی کم ہونے لگیں۔ اس کے علاوہ ۱۹۱۱ء کے فیکٹری قانون میں بھی ترمیم کی گئی اور اوقاتِ محنت کو ۱۱ گھنٹے دن اور ساٹھ گھنٹے ہفتے تک محدود کر دیا گیا۔ (۶۳) بارہ سال سے کم عمر بچوں سے محنت لینے پر پابندی لگا دی گئی اور فیکٹری کی تشریح بھی مختلف انداز میں کی جانے لگی۔ اس ترمیم کے مطابق اس زمرے میں وہ تمام کارخانے آتے تھے جن میں مشینیں استعمال ہوتی ہوں اور کام کرنے والوں کی تعداد ۲۰ افراد سے کم نہ ہو۔ ۱۹۲۳ء میں کانکنی کی صنعت کے بارے میں خاص قانون نافذ کیا گیا جس سے کام کے ہفتے کو ۵۴ گھنٹوں تک محدود کر دیا گیا اور خواتین اور بچوں کی محنت پر پابندی لگا دی گئی۔ ۱۹۲۶ء میں مزدوروں کی ٹریڈ یونینوں کے بارے میں قانون منظور ہوا جس کے مطابق کسی بھی کارخانے کے سات سے زائد افراد سرکاری طور پر اپنی انجمن بنا سکتے تھے۔ ٹریڈ یونین کے آدھے عہدیداروں کا صنعت سے تعلق رکھنا ضروری نہ تھا لیکن آجر کو آزادی تھی کہ وہ ٹریڈ یونین کو تسلیم نہ کرتے ہوئے ان سے گفت و شنید سے انکار کر دے۔ (۶۶)

کمیونسٹوں پر جبر و تشدد کے بڑھنے کی ایک وجہ ہندوستان کے پہلے کمیونسٹ گروپوں کے رہنماؤں کی بائیں بازو کی کجروی تھی۔ ایم این رائے اور مکرجی سامراج مخالف متحدہ محاذ کے امکانات اور ضرورت کو یکسر رد کر دیتے تھے جن میں مقامی بورژوازی بھی شامل ہوتی۔ کمیونسٹ انٹرنیشنل کی دوسری کانگریس میں لینن نے ان کجرویوں پر کڑی تنقید کی جبکہ ڈانگے جنھوں نے اسی عرصے میں کمینٹرن سے رابطہ قائم کیا تھا۔ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ڈانگے نے "سوشلسٹ"

اور غلام حسین نے "انقلاب"، میں متحدہ کمیونسٹ پارٹی بنانے کا مہم کا آغاز کیا۔ اس سلسلے میں ۱۹۲۳ء میں لکھنؤ میں ایک اجلاس بلایا گیا جسے سبوتاژ کرنے کے لیے حکام نے بہت سے کمیونسٹ رہنماؤں کو گرفتار کرلیا۔ کمیونسٹ اور جمہوریت پسندوں کی گرفتاری سے ہڑتالوں اور مظاہروں کا نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ۱۰، اپریل ۱۹۲۲ء میں بالشویک سازش کے نام سے مقدمے کا آغاز ہوا اور تمام کمیونسٹ رہنماؤں کو چار سال قید با مشقت کی سزا دی گئی۔ پنجاب، سندھ، سرحد اور ہندوستان کے بعض علاقوں کے کمیونسٹ مزدوروں کے درمیان کانگریس کے اثر و نفوذ سے متاثر ہو کر یہ خیال رکھتے تھے کہ کانگریس ہی میں کمیونسٹ پارٹی تشکیل دی جانی چاہیئے۔

ان حالات کے پس منظر میں ۱۹۲۵ء میں کانپور میں کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد رکھ دی گئی جس کے قیام سے مزدور اور ٹریڈ یونین تحریک کی نئی منزل کا آغاز ہوا۔ ۱۹۲۶ء میں کمیونسٹوں کی ایما پر ہفتہ وار "ریلوے ہیرلڈ"، کی اشاعت شروع کی گئی جس کا نعرہ تھا "دنیا کے مزدورو جاگو، اٹھو اور متحد ہو جاؤ"۔ اس ہفتہ وار رسالے نے انقلابی نظریات کے پھیلانے میں بہت مدد دی اس کے صفحات پر AITVC کی اصلاح پسندانہ پالیسیوں پر سخت تنقید کی جاتی (۵۹) مئی ۱۹۲۷ء میں بمبئی میں ہونے والی کمیونسٹ پارٹی کی دوسری کانگریس کے فیصلوں کی روشنی میں سندھ اور پنجاب میں نئی یونینوں کا قیام عمل میں لایا گیا جن میں سندھی مزدوروں کی انجمن کراچی بندرگاہ کے مزدوروں کی انجمن اور بہت سی دوسری ٹریڈ یونین شامل تھیں۔ (۶۴)

۱۹۲۶ء میں پنجاب کے کمیونسٹوں کی مدد سے دو مزدور کسان گروپ قائم کیئے گئے۔ لاہور کا گروپ ٹیکسٹائل ریلوے اور میونسپل مزدوروں کو متحد کیے ہوئے تھا۔ ۱۹۲۸ء میں یہ دونوں گروپ پنجاب مزدور کسان پارٹی میں یکجا ہو گئے اور اس نے

رسالوں "مزدور کسان" اور "کرتی" کی اشاعت شروع کی ۔ ۱۹۲۹ء کے شروع میں لاہور کے ریلوے مزدوروں کی عام ہڑتال مزدور کسان پارٹی کی زیر قیادت کامیابی سے ہمکنار ہوئی ۔ حالانکہ AITVC نے مزدور تحریک کو سیاست سے علیحدہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن کمیونسٹوں کے زیر قیادت پرولتاریہ استعماریت، سرمایہ داری اور سامراج کے خلاف فیصلہ کن جدوجہد میں حصہ لیتی رہی ۔ اس انقلابی تحریک کے دباؤ میں AITVC نے بھی اپنا رویہ بدلا اور ان سیاسی مطالبات کا ساتھ دینے لگی ۔ AITVC میں بائیں بازو کے مضبوط ہونے اور مزدور کسان و کمیونسٹ پارٹیوں کی ہڑتالوں کو منظم کرنے سے ۲۸-۱۹۲۷ء میں مزدور تحریک میں نیا ابھار دکھائی دیتا ہے ۔ اس صورتِ حال کے جنم لینے میں سائمن کمیشن کا بھی اہم کردار تھا جس میں ایک بھی ہندوستانی شریک نہیں کیا گیا تھا ۔

۳۴-۱۹۲۹ء کے عالمی اقتصادی بحران نے برطانوی ہندوستان کے تمام صوبوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا جس کے نتیجے میں مقامی بورژوازی اور کالونی گیروں نے محنت کش عوام کے سماجی و معاشی حقوق کو غصب کرنے کے عمل کو تیز کر دیا ۔ اس عرصے میں برطانوی ، امریکی ، جرمن اور جاپانی مصنوعات کی درامدات میں تین گنا اضافہ ہوا جبکہ ۱۹۲۵ء کے مقابلے میں ۱۹۳۰ء میں پنجاب اور سندھ سے ہونے والی خام مال کی برآمدات میں ۴۲ فیصد کمی واقع ہوئی (۶۷) برآمدی اشیاء کی وسیع پیمانے پر مارکیٹ میں یلغار سے نہ صرف دستکار متاثر ہوئے بلکہ کارخانوں کے مقامی مالکان کو بھی شدید نقصان اٹھانا پڑا ۔ بے روزگاری میں نمایاں اضافہ ہوا ۔ مختلف اندازوں کے مطابق صرف کراچی میں ۲۵،۰۰۰ بے روزگار افراد موجود تھے ۔ بے روزگار محنت کشوں میں کھچاؤ کم کرنے کے لیے نوآبادیاتی حکمرانوں نے انھیں بیرون ملک بھیجنے کی پالیسی اپنائی اور صرف ۱۹۳۰ء میں تین لاکھ افراد کو برما

روانہ کر دیا گیا (۶۷) پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے ہزاروں بے روزگار اپنا گھربار چھوڑتے ہوئے مشرق وسطیٰ اور افریقہ کا رخ کرنے لگے۔ (۴۴)

۱۹۲۸ء میں شمال مغربی ہندوستان کے ٹریڈ یونینوں کے رہنماؤں کے مطابق ایک مزدور خاندان کی کم سے کم ضروریات پوری کرنے کے لیے ۷۰، روپے ماہوار کی ضرورت تھی جبکہ اوسط ماہانہ آمدنی ۲۵-۲۰ روپے سے تجاوز نہیں کرتی تھی جبکہ ریلوے میں کام کرنے والے انگریز انجینئروں کی تنخواہ ۲۵۰۰ روپے اور ڈائریکٹر کی تنخواہ ۲۷۰۰ روپے تھی۔ (۶۲) ۱۹۲۷ء میں ریلوے کے ۵۴۷ مزدور خاندانوں کے گھریلو بجٹ کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر احمد مختار لکھتے ہیں کہ ان میں سے ۳۷ فیصد خاندان جیلوں سے بدتر زندگی بسر کرتے ہیں جبکہ ۲۷ فیصد خاندانوں کا معیار زندگی اس سے تھوڑا ہی اونچا ہے۔ بھوک سے بچنے کے لیے مزدوروں کو بنیے سے قرض لینا پڑتا۔ اوٹیلی کمیشن کے مطابق پنجاب کے ۶۲ فیصد اور کراچی کے ۸۷ فیصد مزدور قرض دار تھے۔ پنجاب میں ایک روپے قرض پر ایک آنہ ماہانہ سود دینا پڑتا جبکہ کراچی میں یہ شرح دو آنے تھی (۴۴) قرض ادا نہ کر سکنے کی صورت میں ان کے بیوی بچوں سے جبری محنت لی جاتی۔ زیادہ تر محنت کش ساری زندگی یہ قرض ادا نہیں کر پاتے تھے۔ خواتین کو ایک تو ۳۰۔۴۰ فیصد کم اجرت دی جاتی تو دوسری طرف کارخانے میں انھیں کسی قسم کی سہولتیں فراہم نہ کی جاتیں۔ نرسریوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے خواتین اپنے شیر خوار بچوں کو نابالغ بچوں کے پاس چھوڑ کر آتیں یا اپنے ساتھ کام پر لے آتیں۔ بچوں کو چپ رکھنے کے لیے افیم استعمال کی جاتی جس سے بچوں کی اموات میں بے تحاشا اضافہ ہوا۔ ۱۹۲۶ء میں پنجاب میں پیدا ہونے والے ۱۰۰۰ بچوں میں سے ۲۱۹ بچے ایک سال سے کم عمر میں وفات پا جاتے۔ (۴۴) ۱۹۲۸ء میں AITVC نے زیر زمین کاموں

میں خواتین کی محنت پر پابندی لگانے کا مطالبہ کیا جسے بالآخر منظور کر لیا گیا۔ ۱۹۲۹ء تک خواتین کو زچگی پر تنخواہ نہیں دی جاتی تھی بلکہ بچے کی پیدائش کے بعد انھیں کام سے نکال دیا جاتا۔ اوٹلی کمیشن کے مطابق صرف ۲۵ فیصد مزدوروں کو آجروں کی جانب سے رہائش کی سہولت مہیا کی جاتی (۶۴) یہ الگ بات ہے کہ وہ رہائش کے قابل نہ ہوتیں۔ عزت اور صحت کے لیے مضر رہائشی حالات سے مختلف قسم کی بیماریاں پھیل جاتیں۔ ۱۹۲۷ء میں لیاری کے علاقے میں طاعون پھیل جانے سے پوری مزدور بستی کھنڈر بن گئی۔ (۶۴) ڈاکٹر احمد مختار کے معاشرتی سروے کے مطابق ۲۹-۱۹۲۸ء میں پنجاب اور سندھ کے مزدور کے اوسط راشن میں ۱۹۰۰-۱۸۰۰ کیلوری شامل ہوتی تھیں۔ جبکہ برطانوی ہندوستان میں جسمانی محنت کرنے والے مزدور کو کم از کم ۳۰۰۰ ہزار کیلوری کی ضرورت تھی (۶۸) جسمانی ضروریات کے پورا نہ ہونے سے زیادہ تر مزدور ۳۰ سال سے کم عمر میں وفات پا جاتے۔ پنجاب میں آبادی کی اوسط عمر صرف ۲۵ برس تھی۔ سرحد اور بلوچستان میں اوسط اس سے بھی کم تھی کیونکہ پنجاب اور سندھ کے مقابلے میں یہاں اجرتیں اور بھی نیچی تھیں۔

۱۹۲۷ء کے آواخر تک مزدور تحریک کی قیادت خصوصاً سندھ اور پنجاب میں اصلاح پسند رہنماؤں کے ہاتھ میں تھی لیکن اب کمیونسٹ گروپوں کے اثر و نفوذ میں قابلِ قدر اضافہ ہوا۔ جنوری ۱۹۲۸ء میں مزدور کسان پارٹی کی زیرِ قیادت سندھ کے بالائی علاقوں ملتان اور بہاولپور میں کسانوں نے جاگیردار اور سامراج کے مخالف جلسے اور مظاہرے کیے جو زمینوں کو کاشت کاروں کے حوالے کرنے، زمین اور پانی پر لگان کی منسوخی اور ہندوستانی محنت کشوں کے نوآبادیاتی استحصال کے خاتمے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اسی عرصے میں سندھ اور پنجاب کے طالب علموں نے بھی سامراج مخالف تحریک میں حصہ لینا شروع کیا۔ فروری ۱۹۲۸ء میں سائمن

کمیشن کی ہندوستان آمد کے موقع پر سیاسی ہڑتالوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اس کی بمبئی آمد پر ڈیڑھ لاکھ ٹیکسٹائل مزدوروں نے تاریخ ساز مظاہرہ کیا۔ لاہور، راولپنڈی، سکھر، کوئٹہ، بمبئی، کراچی، حیدرآباد، پشاور اور ملتان میں بھی ہڑتالیں اور جلسے و مظاہرے ہوئے۔ ۲۶ جولائی اور ۱۸ اگست کے درمیان کلکتہ کے مزدوروں سے یکجہتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے لاہور میں ۱۰ ہزار مزدوروں نے جلوس نکالا جو سرخ جھنڈا لہرا رہے تھے اور سامراج مخالف نعرے بلند کر رہے تھے۔ اس مظاہرے پر گولی چلا دی گئی۔ مزدوروں کے شدید دباؤ میں آکر حکام کو لاہور میں ہونے والے خونی واقعات پر خصوصی کمیشن قائم کرنا پڑا۔ فروری ۱۹۲۸ء میں سب سے بڑی ہڑتال کراچی بندرگاہ کے مزدوروں نے کی۔ (۶۹)
۸ اپریل کو سامراجی مظالم اور مزدور دشمن قوانین پاس کرنے کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے بھگت سنگھ نے قانون ساز اسمبلی میں بم پھینکے۔ انھیں گرفتار کر لیا گیا اور ان پر لاہور سازش کیس شروع کیا گیا جیل کے حکام کی زیادتیوں کے خلاف گرفتار شدگان نے بھوک ہڑتال کر دی جو ۶۳ دن جاری رہی اس ہڑتال نے پورے برطانوی ہندوستان کو ہلا ڈالا اور بہت سی دوسری جیلوں میں نظر بند سیاسی قیدیوں نے بھی یکجہتی کی ہڑتال شروع کر دی۔ اس کیس کے ایک ملزم کی پھانسی پر پورے پنجاب میں عام ہڑتالیں ہوئیں اور دوسرے گرفتار شدگان کو رہا کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ ۱۹۲۹ء میں مزدور تحریک کی کامیابیوں سے گھبرا کر حکومت نے اس سے نمٹنے کے لیے اوٹلی کمیشن ہندوستان بھیجا۔ اپنی ڈیڑھ سال کی سرگرمیوں کے بعد اس کمیشن نے اپنی رپورٹ میں تمام مسائل پر مزدور مخالف رویہ اختیار کیا کمیشن کی سفارشات یہ تھیں۔ ۱۔ ہڑتال کرنے پر مزدوروں کو دی جانے والی کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ سزا کا تعین کیا جائے۔ یہ سزا دو سے پانچ سال

تک کی قید اور پانچ سے پندرہ ہزار روپے جرمانے تک ہونی چاہیئے۔
۲:۔ مزدوروں کو کام پر لینے سے پہلے ایک معاہدے پر دستخط کروانے چاہئیں جس کا مضمون کمیشن نے تیار کیا تھا۔ ۳:۔ مزدوروں سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جائے کیونکہ تھکنے والا مزدور ہڑتال کے بجائے آرام کا سوچتا ہے۔(۴۶)
۱۹۲۹ء میں نوآبادیاتی حکام نے صنعتی تنازعوں کے بارے میں قانون منظور کیا جس کے مطابق ہڑتال کے خواہش مند حضرات کو دو ہفتے قبل انتظامیہ کو نوٹس دینا ہوگا۔ قانون کسی بھی ہڑتال کو معاشرے کے لیے مضر قرار دیتے ہوئے غیر قانونی قرار دے سکتا ہے۔ سیاسی ہڑتالوں کو غیر قانونی قرار دیا گیا۔ کارخانوں کے مالکان نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تنخواہوں میں کمی کر دی صرف ۳۱۔۱۹۳۰ء میں مزدوروں کی تنخواہ میں ۴۰۔۳۰ فیصد کم کر دی گیئں۔
دسمبر ۱۹۲۹ء میں لاہور میں منعقد ہونے والی انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس میں مزدوروں کے پرجوش مطالبے پر ہندوستان کو مکمل آزادی دینے کی حمایت میں قرارداد منظور کر لی گئی۔ لیکن اس عرصے تک مزدوروں کا اتحاد برقرار نہ رہ سکا۔ نومبر میں ۱۹۲۹ء میں ناگپور میں ہونے والے AITVC کی دسویں کانگریس میں کمیونسٹوں اور اصلاح پسندوں کے درمیان اختلافات زیادہ ابھر کر سامنے آئے۔ کانگریس میں بائیں بازو کی جانب سے اوٹیلی کمیشن سے بائیکاٹ میرٹھ سازش کیس میں ملوث لوگوں کی رہائی۔ اور سامراج مخالف لیگ میں AITVC کی شمولیت کے مطالبات پیش کیئے گئے۔ اصلاح پسند رہنماؤں نے ان مطالبات کی شدید مخالفت کی لیکن اقلیت میں ہونے کے باعث AITVC سے نکل گئے ان کے ساتھ تیس ٹریڈ یونین تھیں جن میں کراچی بندرگاہ، سندھ کے تجارتی فلوٹ اور پنجاب کے روئی کی صفائی کرنے والے کارخانوں کی یونین شامل تھیں

(۵۲) ان کے نکل جانے سے AITVC میں ۵۰ ٹریڈ یونینیں رہ گیئں جن کے ممبران کی تعداد ایک لاکھ ۸۸ ہزار تھی جن میں ریلوے لاہور اور سندھ کے ٹیکسٹائل اور سرحد کی بعض یونین شامل تھیں۔ علیحدہ ہونے والے گروپ نے انڈین فیڈریشن آف ٹریڈ یونین کے نام سے الگ تنظیم بنالی۔

عالمی اقتصادی بحران کے دور میں مزدور تحریک میں پھوٹ پڑ جانے سے سخت نقصان ہوا اور مزدوروں کی مشترکہ جدوجہد کو منظم کرنے میں شدید دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ قومی آزادی اور مزدور تحریک میں اپریل ۱۹۳۰ء میں شروع ہونے والی بغاوت ایک اہم واقعہ تھی۔ ۲۵، اپریل تک پشاور مکمل طور پر باغیوں کے قبضے میں آچکا تھا۔ ہندوستانی سپاہیوں نے باغیوں پر گولی چلانے سے انکار کر دیا۔ مئی کے وسط میں انگریزی افواج کی مدد سے شہر میں برطانوی اقتدار پھر بحال ہو گیا۔ مئی ہی میں آفریدی اور مہمند قبائل نے بھی بغاوت کر دی۔ پشاور سے یکجہتی کے اظہار میں پورے پنجاب میں ہڑتالیں اور مظاہرے ہوئے۔ ۱۹۳۱ء تک سرحد میں سرخپوش رضا کاروں کی تعداد دو لاکھ سے تجاوز کر چکی تھی۔ قومی آزادی اور مزدور تحریک کے دباؤ میں آکر ۱۹۳۰ء میں سائمن کمیشن نے سندھ کو علیحدہ صوبہ بنانے اور سرحد کی اپنی قانون ساز اسمبلی بنانے کی تجویز پیش کی۔

پشاور میں بغاوت کو دبانے کے بعد سندھ اور پنجاب کے مزدوروں پر بھی تشدد میں اضافہ کر دیا گیا۔ ۳۱-۱۹۳۰ء میں یہاں کئی دفعہ پرامن مظاہروں پر گولی چلائی گئی۔ ۱۹۳۰ء کی گرمیوں میں کراچی اور راولپنڈی میں ہنگامی صورت حال کا اعلان کر دیا گیا۔ اپریل ۱۹۳۱ء میں بھگت سنگھ اور اس کے دو ساتھیوں کو پھانسی دیے جانے پر کراچی، لاہور، ملتان، حیدر آباد اور کوئٹہ اور کئی دوسرے شہروں میں مظاہرین کی پولیس اور فوج سے متعدد بار جھڑپیں ہوئیں۔ اسی عرصے میں مزدور تحریک

کو ایک دھچکہ تب پہنچا جب AITVC سے کمیونسٹوں کو نکلنے پر مجبور کر دیا گیا۔ اور انھوں نے ریڈ کانگریس آف ٹریڈ یونینز بنانے کا فیصلہ کیا جس میں پنجاب اور سندھ کی ٹریڈ یونین شامل تھیں۔ اس طرح ملک میں تین ٹریڈ یونین مرکزوں کے ابھر آنے سے مزدور تحریک کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا جس سے آجروں اور حکومت کو اپنی من مانی کرنے کا موقع ملا۔ ۱۹۳۱ میں گاندھی اور وائسرائے اردن کے درمیان معاہدہ ہوا اور سول نافرمانی کی تحریک کو ختم کر دیا گیا جس سے مزدور تحریک اور کمزور پڑ گئی۔ اس طرح ۱۹۲۹ء کے مقابلے میں ۱۹۳۲ء میں ہڑتالوں میں حصہ لینے والے محنت کشوں کی تعداد میں دوگنا کمی ہوئی اور ۶۵ فیصد ہڑتالیں بغیر کسی نتیجے کے ختم ہوئیں۔ (۷۰)

مزدور تحریک میں یہ وقتی کمزوری بنیادی طور پر سندھ اور پنجاب تک محدود تھی۔ جہاں تک سرحد اور بلوچستان کی نوزائیدہ پرولتاریہ کا تعلق تھا تو وہ اپنی قلیل تعداد کے باوجود سامراج مخالف تحریک میں سرگرم حصہ لے رہی تھی۔ سرمایہ داری کی ترقی سے صنعت اور دست کاری کی کارگاہیں شہروں میں مرتکز ہو رہی تھیں جس کے نتیجے میں شہری آبادی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ سرحد میں ٹیکسٹائل، قالین اور فرنیچر کے کارخانے قائم ہو رہے تھے جن میں ۶۰۔۷۰ مزدور کام کرتے تھے۔ سرحد کے کارخانوں میں جنگی سامان تیار کرنے والے سرکاری کارخانے نسبتاً زیادہ بڑے تھے جن میں تین تین سو مزدور برسرِ کار تھے۔ ۱۹۳۳ء میں یہاں کے چھ ہزار صنعتی مزدوروں میں آدھے سے زیادہ پشتون تھے جب کہ سالانہ نو ہزار پشتون روزگار کی تلاش میں صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ شہروں کا رخ کر رہے تھے۔ (۴۲) بلوچستان میں بھی زرعی دست کاروں، کسانوں اور گلہ بانوں کے تباہ ہو جانے سے نئے شہر وجود میں آ رہے تھے۔ ۱۸۹۱ء اور ۱۹۳۱ کے درمیان شہروں کی تعداد ۴ سے بڑھ کر

۱۲ ہوگئی اور ان کی آبادی ۲۵ ہزار سے بڑھ کر ایک لاکھ ہوگئی۔ (۱) ۱۹۳۱ء میں یہاں صنعت کی مختلف شاخوں میں نقل وحمل اور کانکنی میں ۲۵ ہزار مزدور کام کرتے تھے جبکہ زرعی مزدوروں کی تعداد بھی اتنی ہی تھی۔

پنجاب اور سندھ میں بھی عالمی معاشی بحران کی پیدا کردہ مشکلات کے باوجود نئے کارخانوں کی تعمیر کا کام جاری تھا اور بڑے کارخانوں میں مزدوروں کا ارتکاز بھی ہونے لگا۔ صرف ۳۴-۱۹۳۳ء میں صنعتی مزدوروں کا ۲۳ فیصد حصّہ ایسے کارخانوں میں کام کرتا تھا جن میں ۳۰۰ سے زائد مزدور برسرکار تھے۔ (۲) کمیونسٹوں کے زیرِ اثر پنجاب اور سندھ کی پرولتاریہ نے پہلی مرتبہ مزدوروں کے قرضوں کی معافی اور فرنگیوں کے کارخانوں کو قومی ملکیت میں لینے کا مطالبہ شروع کیا۔ میرٹھ کے نظربندوں کی آزادی کی جدوجہد نے اس وقت پھر زور پکڑا جب کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکریٹری مظفر احمد کو پھانسی دینے کا اعلان کیا گیا اور دوسرے نظر بندوں کو طویل مدت کی قید کی سزائیں سنائی گئیں۔ پنجاب اور سندھ کے مختلف شہروں میں رہائی کمیٹیاں بنائی گئیں جنھوں نے مظاہروں کا اہتمام کیا۔ انگلستان، فرانس، سوویت یونین، جرمنی، آسٹریا، اور بعض دوسرے ممالک کی کمیونسٹ پارٹیوں نے اس سزا پر بھرپور احتجاج کیا۔ اندرونی اور بیرونی دباؤ سے مجبور ہوکر برطانوی حکمرانوں کو مقدمہ واپس لینا پڑا اور تمام نظربندوں کو رہا کر دیا گیا۔ ۱۹۳۴ء کے آغاز میں کمیونسٹوں نے پورے ملک میں سیاسی ہڑتال منظم کرنے اور مزدور طبقے کی قیادت میں سامراج مخالف فرنٹ بنانے کے لیے کام شروع کیا۔ یہ سیاسی ہڑتال تین مہینے جاری رہی۔ ہڑتالی مزدور ۸ گھنٹے کے دن، تنخواہوں میں اضافے، سیاسی قیدیوں کی رہائی اور چھانٹیوں کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔ صرف لاہور میں ۲۱۰ سرگرم مزدور نمائندوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ جولائی ۱۹۳۴ء کمیونسٹ پارٹی سمیت بہت سی

انقلابی جماعتوں پر پابندی عائد کر دی گئی۔

لیکن ساتھ ہی نوآبادیاتی حکام کو کچھ پیچھے ہٹنا پڑا۔ ۱۹۳۴ء میں نیا لیبر قانون منظور کیا گیا جس میں محنت کے ہفتے کو ۵۴ گھنٹوں تک محدود کر دیا گیا تھا۔ لیکن اس قانون کا اطلاق موسمی کارخانوں پر نہیں ہوتا تھا۔ اس قانون کی منظوری مزدور تحریک کی نمایاں کامیابی تھی۔ ۱۹۳۵ء میں کمیونسٹوں کی پیشقدمی پر ریڈ کانگریس آف ٹریڈ یونینز اور AITVC پھر سے متحد ہو گئیں۔ اتحاد کے معاہدے میں طبقاتی جدوجہد کو ٹریڈ یونین تحریک کی بنیاد تسلیم کرتے۔ نظریات کے آزاد پرچار اور تحریک آزادی میں موجود مختلف سیاسی نظریات پر تنقید کے حق کو دونوں طرف سے تسلیم کیا گیا تھا۔

دوسری جانب بلوچستان اور سرحد میں آدھے سے زیادہ مزدور اور ملازمین ٹریڈ یونین کے رکن نہیں تھے جس کی بنیادی وجہ بڑی صنعتوں کا فقدان تھا جبکہ جنگی ساز و سامان تیار کرنے والے کارخانوں میں انتظامیہ مزدوروں کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھتی تھی۔

اس صدی کی چوتھی دھائی میں مزدور تحریک کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ سامراج دشمنی کے ساتھ ساتھ مقامی سرمایہ کاروں کے خلاف بھی بھرپور جدوجہد کرنے لگی تھی۔ اس عرصے میں صنعتی ترقی کا رخ یکطرفہ رہا اور ذرائع پیداوار کی پیداوار کرنے والے کارخانوں کے قیام سے گریز کیا گیا جس کے دیگر فوائد کے علاوہ صنعتی پرولتاریہ کے ارتکاز میں اضافہ ہوتا ۱۹۳۵ء میں سائمن کمیشن کے تیار کردہ قانون کے نفاذ سے سامراج مخالف مظاہروں میں شدید اضافہ ہوا۔ اس قانون میں گورنر جنرل کے اقتدار کو برقرار رکھا گیا۔ اس قانون کے نفاذ سے بورژوازی اور جاگیرداروں میں مایوسی اور آبادی کے وسیع تر حصوں میں غم و غصہ کی

لہر دوڑ گئی۔

۲۷۔ ۱۹۳۶ء میں برطانوی ہندوستان میں صوبائی دستور ساز اسمبلیوں کے انتخابات سے سیاسی فضا میں سرگرمی پیدا ہوئی۔ مزدور طبقے، کسانوں اور ترقی پسند دانشوروں کی جانب سے انتخابی کمیشن سے محنت کش نمائندوں کو انتخاب میں حصّہ لینے کی اجازت دینے کا مطالبہ کیا گیا جسے حکام نے مسترد کر دیا۔ اس کے جواب میں پشاور، کراچی، سکھر اور لاہور میں عظیم الشان مظاہرے کیے گئے۔ اور انتخابات کو ڈھونگ قرار دیا گیا۔ انتخابات میں سندھ سے صوبے کی بمبئی سے علیحدگی کا مطالبہ کرنے والی یونائیٹڈ پارٹی، پنجاب میں یونینسٹ پارٹی، سرحد میں سرخ پوش اور بلوچستان میں خادم وطن نامی تنظیموں کو کامیابی حاصل ہوئی۔ یہ تمام پارٹیاں کانگریس سے منسلک تھیں۔ محنت کش عوام کی جانب سے ان جماعتوں کی حمایت کرنے کی وجہ ان کی جانب سے کامیابی کی صورت میں ایسے اقدامات اٹھانے کی یقین دہانی شامل تھی جو مزدوروں کی حالت بہتر بنانے میں مدد دیتے۔ لیکن کامیابی کے بعد ایک بھی پارٹی اپنے وعدوں پر پورا نہیں اتری جس سے مزدور تحریک میں پھر سے سرگرمی پیدا ہوئی۔ بمبئی کے مزدوروں سے یکجہتی کا اظہار کرتے ہوئے راولپنڈی اور لاہور کے ریلوے مزدوروں نے ہڑتال کر دی۔ دسمبر ۱۹۳۸ء میں سندھ، کوئٹہ اور ملتان کے مزدور وقفوں سے ہڑتالیں کرتے رہے۔

اپریل میں آل انڈیا کانگریس آف ٹریڈ یونینز AITVC کی چودھویں کانگریس میں اپنی ابتدائی تنظیموں کے دباؤ میں آکر نیشنل فیڈریشن آف ٹریڈ یونینز دوبارہ AITVC میں شامل ہوگئی۔ ۳۹-۱۹۳۷ء کے دوران یکجہتی کی ہڑتالوں کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا۔ ۴۰-۱۹۳۹ء میں برطانوی حکام نے مزدوروں کے اتحاد کو توڑنے کی غرض سے ہندو اور مسلمانوں مذہبی منافرت پھیلانے کی کوشش

کی جس میں انھیں تھوڑی بہت کامیابی بھی ہوئی اور ہڑتالوں کی تعداد کم ہو گئی۔ ان فسادات کے پھیلنے میں قرارداد پاکستان پیش ہونے کے علاوہ دائیں بازو کے ہندو رہنماؤں کی جارحانہ سرگرمیوں کا بھی کافی دخل تھا۔ زیادہ تر محنت کش مسلمان قیامِ پاکستان سے یہ امید رکھتے تھے کہ اس سے انھیں سرمایہ داروں، جاگیر داروں اور بیوروکریسی سے نجات مل جائے گی۔

ستمبر ۱۹۳۹ء میں برطانیہ دوسری جنگ عظیم میں کود پڑا جس سے پورے ہندوستان میں جنگ کے خلاف ہڑتالیں اور مظاہرے شروع ہو گئے۔ ۱۹۴۰ء میں جنگ کے متعلق رویے کا مسئلہ AITVC کی اٹھارویں کانگریس میں زیر بحث آیا جس میں دی دی گری کی جانب سے پیش کی جانے والی قرارداد منظور کرلی گئی جس میں کہا گیا تھا کہ وہ جنگ جو ہندوستان کی آزادی کی جانب نہیں لے جاتی اس کی مخالفت کی جانی چاہیئے۔ ۱۹۴۱ء میں بہت سے لوگ جو اس فیصلے کے حق میں نہیں تھے AITVC سے علیحدہ ہو گئے اور انڈین فیڈریشن آف لیبر IFL کے نام سے نئی تنظیم بنالی جس کے جنرل سیکریٹری ایم این رائے تھے۔ اس فیڈریشن میں پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کے بہت سے مشہور مزدور رہنما شریک تھے۔ حکام نے کی جانب سخت رویہ اختیار کیا اور اس پر مظاہروں میں شریک ہونے پر پابندی لگا دی گئی۔ ۱۹۴۳ء میں AITUC کی بیسویں کانگریس میں کمیونسٹ رہنما ڈانگے کو اپنا چیئرمین چن لیا گیا۔

۱۹۴۲ - ۴۳ میں جنگی اخراجات کے بڑھنے اور مہنگائی میں اضافے کے خلاف مزدوروں کے مظاہرے جاری رہے۔ اگر ۱۹۳۸ء میں بجٹ کا ۴۰ فیصد حصہ جنگی اخراجات پر صرف ہوتا تھا تو ۱۹۴۴ - ۴۵ء میں یہ شرح ۷۹ فیصد تک پہنچ گئی۔ (۷۳) ۱۹۳۹ - ۴۷ کے درمیان مہنگائی میں چار گنا اضافہ ہوا جبکہ محنت کشوں کی تنخواہیں

محض دوگنا بڑھیں۔ ۴۶-۴۲ ۱۹ کے درمیان ہڑتالوں میں بھی زبردست اضافہ ہوا جولائی ۱۹۴۲ء میں کمیونسٹ پارٹی پر سے پابندی ہٹا دی گئی۔ AITUC جو پنجاب اور سندھ کی بیشتر ٹریڈ یونینوں کو متحد کیے ہوئے تھی میں کمیونسٹوں کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ ہندوستان کی اندرونی سیاسی صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے کمیونسٹوں کا خیال تھا کہ اس جنگ کو سامراج مخالف تحریک میں بدلتے ہوئے ہندوستان کو مکمل آزادی دلائی جائے (۴۷)۔ نومبر ۱۹۴۵ء میں اکتوبر انقلاب کی سالگرہ کے موقع پر ہزاروں افراد کے جلسے میں انڈونیشیا اور ہند چینی کے محنت کشوں کی جنگ آزادی کو کچلنے میں ہندوستانی افواج کے استعمال پر زبردست احتجاج کیا گیا۔ فروری ۱۹۴۶ء میں کراچی کے جہازیوں اور بندرگاہ کے مزدوروں نے انگریز افسران کے رویے کے خلاف ہڑتال کر دی جس میں بمبئی کے ہڑتالی جہازیوں سے یکجہتی کا اظہار کیا گیا۔ کمیونسٹ پارٹی کی اپیل پر لاہور، کراچی، پشاور ملتان، کوئٹہ اور دوسرے شہروں کے محنت کشوں نے بھی ہڑتال کر دی۔ کراچی کے مزدوروں کی زبردست مزاحمت کے باوجود بغاوت کو افواج کی مزاحمت سے فرو کر دیا گیا۔

مزدور اور قومی آزادی کی تحریک کے زور پکڑ جانے کی وجہ مزدور طبقے کی تعداد میں اضافہ اور تنظیمی طور پر متحد ہونا تھا۔ ۴۵-۱۹۲۹ء کے درمیان پنجاب میں کارخانوں کی تعداد ۸۰۰ سے بڑھ کر ۱۲۵۵ ہو گئی اور مزدور ۸۷ ہزار سے بڑھ کر ایک لاکھ ۵۸ ہزار ہو گئے۔ (۵۷)۔ جون ۱۹۴۶ء میں دستور ساز اسمبلی کے انتخابات کے بعد نہرو کو عبوری حکومت بنانے کی دعوت دی گئی۔ مسلم لیگ نے حکومت میں شرکت سے انکار کرتے ہوئے اپنے حامیوں کے مظاہرے منظم کیے جس سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان خونی تصادم شروع ہو گیا۔ پنجاب میں ان

فسادات کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے کمیونسٹ رہنما مرزا ابراہیم کی قیادت میں ایک روزہ ہڑتال کی گئی۔ ۱۹۴۶ء کے دوسرے نصف میں مزدوروں کی بڑے پیمانے پر چھانٹی کے خلاف ریلوے مزدوروں کی کل ہند عام ہڑتال ہوئی۔ اسی سال ڈاک اور تار کے ملازمین کی ہڑتال بھی نمایاں تھی۔ ۲۶ دن تک ایک بھی ڈاکخانے میں کام نہیں ہوا۔ ان سے یکجہتی کا اظہار کرتے ہوئے ٹیکسٹائل اور ٹرام کے مزدوروں اور طالب علموں نے بھی ہڑتال کر دی۔

ہم قیامِ پاکستان پر تفصیلاً بحث نہیں کریں گے جو پہلے ہی بہت لوگ کر چکے ہیں۔ اگست ۱۹۴۷ء میں ہندوستان اور پاکستان کی آزادی میں یہاں کے محنت کشوں کا کردار انتہائی فعال تھا۔ تقسیم کے نتیجے میں ۵۵ لاکھ ہندو اور سکھ ہندوستان منتقل ہوئے جبکہ پاکستان ہجرت کر آنے والے مسلمانوں کی تعداد ۶۵ لاکھ تھی۔ اس دوران ہونے والے فسادات میں لاتعداد محنت کش ہلاک اور صنعتی ادارے تباہ ہو گئے۔ ان فسادات میں پنجاب سب سے زیادہ متاثر ہوا۔ جہاں لاہور، ملتان، راولپنڈی، ڈیرہ اسماعیل خان اور لائل پور کی صنعتوں کو شدید نقصان پہنچا اور ہزاروں افراد ہلاک کر دیے گئے۔ ۱۹۴۷ء کی تقسیم سے مزدور طبقے اور مزدور تحریک کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ ٹریڈ یونین تنظیموں سے متعلق بے شمار ہندو اور سکھ رہنما اور کارکن یہاں سے ہجرت کر گئے جس سے بہت سی یونینوں کی سرگرمیاں معطل ہو کر رہ گئیں۔ ہندوستان سے پاکستان ہجرت کرنے والے لاکھوں لوگوں کی آمد سے پاکستان کے مزدور طبقے کا ڈھانچہ، تعداد اور ساخت یکسر تبدیل ہو گئی۔

تلخیص و ترجمہ :۔ ندیم خالد

باقی اگلے مجموعے میں۔

BIBLIOGRAPHY

1. Checherov, A.I., "Economic Development of India before British Occupation", Craft and Trade in 16-18 Centuries, Moscow, 1965.
2. یوری گنکووسکی ، پاکستان کی قومیتیں ، ماسکو
3. مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی ، تاریخ سندھ ، اعظم گڑھ ، ۱۹۴۷
4. عقیق شمس سراج ، تاریخ فیروز شاہی ، کلکتہ ، ۱۸۹۱
5. مرزا محمد جہانگیر ، تزک جہانگیری ، لکھنو ،
6. محمد حسن ، جہانگیر کا سفر پنجاب ، لکھنو ، ۱۹۲۵
7. سید محمد لطیف ، تاریخ لاہور ، لاہور ۱۸۹۲
8. "The Pakistan Review", Karachi.
9. اقبال نامہ اکبری ، جلد ۵ ، علیگڑھ
10. Grigorian R.N., "The Formation of Working Class in Pakistan", Moscow, 1973.
11. Hamayun, Kabir., "Indian Culture", New Delhi
12. Hamilton A., "A New Account of the East Indies (1688-1723)", Trading and Traveling by Sea, Vol.1, Edinburgh, 1727.
13. "International Working Class Movement", Questions of History and Theory, Vol.1, Moscow, 1976.
14. Chablani, S.P., "Economic Conditions in India (Sind) 1592 To 1843", Bombay,1951.
15. "Russian Indian Relations in 18th Century", Documents, Moscow, 1965.

16. "Pakistan Labour Gazette", Karachi.

17. "Gazetteer of Countries Adjacent to India on the North West including Sind, Afghanistan, Baluchistan, Punjab and Neighbouring States", London, 1844.

18. Burns, A., "Travel to Buchara", Vol.1, Moscow, 1843.

19. Sarkar, J., "History of Aurangzeb", Vol.3, Calcutta, 1916.

20. Semenova, N.I., "The Sikh State: An Outline of Social and Political History of Punjab in 18th and 19th Century", Moscow, 1958.

21. Pikulin M.G., "Baluchi", Moscow, 1959.

22. Elphinston M., "An Account of the Kingdom of Caboul and its Dependencies", London, 1809.

23. "Gazzetteer of the Banu District, 1883-1884", Lahore, 1884.

24. مبشر حسن، شاہراہ انقلاب، لاہور ۱۹۷۵

25. "Problems of Urbanisation in Pakistan, Proceedings of a Conference", Karachi, 1967.

26. باری، کمپنی کی حکومت، لاہور، ۱۹۶۹

27. Feldman H., "Karachi through a Hundred Ages". The Centenary History of the Karachi Chamber of Commerce and Industry, 1860-1960, Karachi, 1960.

28. Masson Ch., "Narrative of Various Journeys in Baluchistan, Afghanistan and Punjab", Vol.1, London, 1842.

29. رحمت فرخ آبادی، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں سندھ کا حصہ
"ماہ نو" ۱۹۷۵ نمبر ۳

30. "Life and Opinions of Sir Charles Napier", Vol.3, London, 1857.

31. Akhtar S.M., "Economy of Pakistan", Karachi.

32. سرسید احمد خان، اسباب بغاوت ہند، علیگڑھ، ۱۹۴۱

33. Dutt R., "The Economic History of India under Early British Rule", London, 1902.

34. K. Marx., "Letter to Danielson N.F.", Vol. 35, Collected Works.

35. "Report of the Indian Irrigation Commission, 1858-1885", Calcutta, 1886.

36. "Parliamentary Papers, 1890-1891", Vol.59, London, 1892.

37. "Quetta Times", Quetta.

38. Baden Powell., "The Land Systems of British India", London, 1892.

39. Gordon L.R., "Agriculture Relations in Indian NWFP (1914-47)", Moscow, 1953.

40. "Gazzetters of Banu, Deraismail Khan and Peshawar Districts", Lahore, 1898.

41. Bird-Smith., "Report on Commercial Conditions in the North Western Provinces of India", London, 1861.

42. "Civil and Military Gazette", Lahore.

43. "East India (Factory Inspection)", London, 1894.

44. Mukhtar Ahmad., "Factory Labour in Punjab", Madras, 1929.

45. Kydd J.C., "A History of Factory Legislation in India", Calcutta, 1920.

46. "Report of Indian Factory Labour Commission, 1908", London, 1908.

47. Ghandhi M., "Indian Cotton Textile Industry: Its Past, Present and Future", Calcutta, 1930.

48. "Gazetteer of the Province of Sind", London, 1876.

49. Kuzmin S.A., "Agriculture Relations in Sind", M. 1959.

50. "Turkistan News", Tashkent.

51. Shaposhnikova L.V., "Condition of Indian Proletariat and Working Class Movement at the End of 19th - Beginning of 20th Century", M, 1958.

52. Pannikkar K.M., "All India Trade Union Congress, M, 1958.

53. Majumdar, "Three Phases of Indian Struggle for Freedom", Bombay, 1961.

54. "Sedition Committee Report (Rowlet Report)", Calcutta, 1918.

55. Hashimov I., "Towards the History of the Working Class Movement in India", Tashkent, 1961.

56. Rustamov V., "North Indian Princely States

and Revolutionary Uprising in 1905-1907 - in India", M. 1956.

57. Deviatkin T.F., "Formation and Activities of 'Gadar' Organisation during First World War", Academy of Sciences, M, 1955.

58. مساوات سیاسی ایڈیشن ، لاہور ، کراچی ، لائل پور

59. "Railway Herald", Lahore.

60. "Report of the Commissioners Appointed by the Punjab Sub-Committees of the National Congress", Vol.2, Bombay, 1920.

61. "Documents of the History of Communist Party of India", Vol.2, New Delhi, 1974.

62. "Report of the Royal Commission on Labour in India", Vol.1-12, L, 1931.

63. "The Indian Year Book, 1925", Bombay, 1926.

64. "Condition of Working Class in India (From the Materials of Royal Commission on Labour in India), M, 1936.

65. "The Trade Union Act, 1926", Allahbad, 1928.

66. "The Indian Year Book and Who is Who", 1931, Bombay.

67. Takin Avin., "History of the Working Class of India", M, 1972.

68. Gordon L.R., "From the History of the Working Class of India", M, 1961.

69. "Mazdoor Kissan", Lahore.

70. Prasada Rao, P.D., "Strikes in India (1860-1970), Hyderabad, 1972.

71. "Census of India, 1931", Vol.15, Calcutta, 1933.

72. "Indian Labour Journal", Weekly, Nagpur.

73. Afzal M., "The Condition of Pakistani Working Class", International Trade Union Movement, 1950, No.12.

74. نیا زمانہ لاہور

75. Anwar A.A., "Effects of Partition on Industries in the Border Districts of Lahore and Sialkot", Lahore, 1953.

صحتِ عامہ کی سیاسیات

اکبر زیدی

تیسری دنیا میں حفظانِ صحت کی ضروریات کی فراہمی خالصتاً ایک سیاسی مسئلہ ہے جو معاشرے میں موجود سماجی، معاشی اور سیاسی ڈھانچے سے براہِ راست منسلک ہے۔ ماہرینِ منصوبہ بندی، ڈاکٹروں اور نوکر شاہی کی طرف سے پیش کی جانے والی یہ دلیل کہ طبی سہولتوں کے فقدان کی وجہ وسائل کی کمیابی ہے محض افسانہ طرازی ہے اور نیک نیت حضرات کو عموماً گمراہ کرتی ہے۔ ہم تیسری دنیا میں حفظانِ صحت کا جائزہ بنیادی طور پر سرمایہ دارانہ ممالک کو مدِ نظر رکھتے ہوئے لیں گے اور دیکھیں گے کہ شعبہ صحت کے بعض حصے کیوں اور کس طرح وجود میں آئے اور ان کی افزائش کیسے ہوئی۔

صحتِ عامہ کے نظام کا تفصیلی جائزہ لینے اور اس کے سماجی معاشی و سیاسی ڈھانچے سے تعلق کی نوعیت واضح کرنے سے پہلے بجائے خود امراض کی ترتیب اور نوعیت پر ایک سرسری نظر ڈالنا زیرِ نظر موضوعات کو سمجھنے میں مفید ثابت ہوگا۔

ترقی پزیر ممالک میں سب سے زیادہ پائی جانے والی بیماریاں وہ ہیں جو انسانی فضلہ کے ذریعے پھیلتی ہیں مثلاً متعدی اسہالی بیماریاں اور ہیضہ، آنتوں میں پیرا سائٹس کی بیماریاں، پولیو، ٹائیفائیڈ اور ہیضہ۔ ان علاقوں میں جہاں پانی کی فراہمی بہتر نہیں ہے اور پانی کا استعمال کمیونٹی بنیادوں پر ہوتا ہے، بیماری پھیلنے کے امکانات

بہت وسیع اور آسان ہوجاتے ہیں۔ "دست اور پیچش کی جملہ اقسام" پاکستان میں سب سے زیادہ پائی جانے والی متعدی بیماریوں میں سے ہیں۔ امراض کی ایک دوسری بڑی قسم وہ بیماریاں ہیں جو ہوا کے ذریعے پھیلتی ہیں۔ یہ بیماریاں متاثرہ افراد کے نظام تنفس کی رطوبتوں کے ہوا کے ذریعے دوسرے افراد تک منتقل ہونے سے پھیلتی ہیں مثلاً تپ دق، نمونیہ، برانکائٹس، انفلوئنزا، خسرہ اور چیچک وغیرہ۔ تیسری دنیا کا تیسرا بڑا قاتل مرض ناکافی غذا اور بھوک ہے۔

اوپر بیان کیے جانے والے امراض تیسری دنیا کے عوام کے اہم ترین قاتلوں میں سے ہیں اور ان میں ایک بات مشترک ہے اور وہ یہ کہ یہ امراض غریبوں کے امراض ہیں۔ درحقیقت یہ غربت ہی ہے جس کے باعث یہ امراض پیدا ہوتے ہیں خواہ وہ پانی کے ذریعے پھیلنے والے ہوں یا ہوا کے ذریعے۔ پانی کے نکاس کا ناکافی بلکہ بالکل غیر موجود نظام، پینے کا گندہ پانی، کھانے کا پست معیار اور تعلیم کی کمی جس کے باعث لوگ صحت کے بارے میں معلومات ہی حاصل نہیں کر پاتے۔ یہ سب دراصل ایک معاشی حقیقت ہے۔ غریب لوگ گندہ کھانا، صاف پانی اپنی مرضی سے استعمال نہیں کرتے بلکہ وہ تو اپنی زندگی برقرار رکھنے کے لیے ایک قلیل تنخواہ کی تعزیر پاتے ہیں۔ ریوڈی ژانیرو کے مضافات ہوں یا کراچی کی بستیاں جہاں ایک تنگ و تاریک جھونپڑے میں خاندان کے دس افراد اکٹھے رہتے ہوں ان میں سے ایک فرد کے بھی مرض کا شکار ہونے سے باقی افراد کا تپ دق، خسرہ اور اسہال کا شکار ہونا لازمی ہے پینے کا صاف پانی مہیا کرنا اور سیوریج کا مناسب انتظام حکومت کی ذمہ داری ہونی چاہیئے۔ مگر یہ سہولتیں عام طور پر بستیوں کی حالتِ زار اور مصائب سے دور اشرافیہ کے پُرآسائش رہائشی علاقوں کو مہیا کی جاتی ہے۔ شہر کے مضافاتی علاقوں میں سیوریج کی کوئی سہولت موجود نہیں ہے اور صرف اجتماعی بیت الخلاء موجود ہیں

جو کئی سو خاندانوں کے استعمال میں رہتے ہیں اور ان کی حالت کو نرم سے نرم الفاظ میں کراہت انگیز کہا جا سکتا ہے۔ اور اسی لیے غالباً استعمال میں بھی نہیں لائی جاتیں تازہ پانی گلی کی نکڑ پر سرکاری نل سے حاصل ہوتا ہے جس پر صبح سے شام تک لمبی قطاریں لگی رہتی ہیں۔ کیچڑ، انسانی فضلہ، کوڑا کرکٹ، مکھی، مچھر، امراض اور انسان ایک ہی جگہ پڑے ہیں۔ تازہ پانی کی کافی مقدار میں فراہمی اور سیورتج کے بہتر انتظام سے زیادہ کوئی بھی اقدام ان شہری مضافات میں صورت حال بہتر بنانے میں مددگار ثابت نہیں ہو سکتا۔

یہ مفروضہ کہ دیہی علاقوں کی حالت بہتر ہے کیونکہ وہاں قدرتی فضا میسّر ہے ایک بڑی غلط فہمی ہے۔ ہاریوں اور بے زمین کسانوں کی معاشی حالت اگر اپنے شہری بھائیوں سے زیادہ بری نہیں تو ان سے اچھی بھی نہیں۔ ایک ایسے نظام کے استحصال میں جکڑے ہوئے جو انسان کو جینے کا حق بھی نہیں دیتا وہ بری بھلی کاٹ رہے ہیں غلیظ پانی اب بھی استعمال ہوتا ہے اور غذا کا استعمال بھی کچھ زیادہ بہتر نہیں ہے۔

پاکستان میں شہری آبادی کا اکیس فیصد حصہ حفظان صحت کی سہولیات سے بہرہ ور ہے جبکہ دیہی آبادی کے صرف دو فیصد حصے کو یہ سہولیات میسر ہیں۔ شہری آبادی کے ۶ء۸۳ فیصد حصے کو پینے کا صاف پانی میّسر ہے جبکہ دیہی آبادی کے صرف ۷ فیصد حصے کو صاف پانی حاصل کرنے کا شرف حاصل ہے۔

طبّی تعلیم

تیسری دنیا میں طبّی تعلیم کی تربیت اور نظام ہمارے نوآبادیاتی بہی خواہوں کی وراثت ہے۔ نہ صرف یہ کہ اسے قبول کیا جاتا ہے بلکہ اسے شعوری طور پر ترقی دی جاتی ہے اور شعبۂ طب کے ہر حصے میں پھیلایا جاتا ہے۔

مستقبل کے طبی ماہرین کو مغربی ممالک میں ڈاکٹروں کے لیے لکھی جانے والی کتابوں سے ان امراض کے بارے میں پڑھایا جاتا ہے جو صرف انھی ممالک میں پائے جاتے ہیں۔ سرکاری افسران اور ڈاکٹروں کے احتیاطی تدابیر اور انسدادی طب پر زور دینے کے مسلسل وعدوں کے باوجود طبی درسگاہوں سے منسلک عظیم الشان ہسپتالوں میں معالجاتی طب پر زور دیا جاتا ہے۔ کمیونٹی میڈیسن تعلیم کے آخری سال میں برائے نام کمیونٹی تجربے کے ساتھ پڑھائی جاتی ہے۔ حیاتیاتی شماریات اور دبائیات سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔

تیسری دنیا میں تدریسی ہسپتال "مرض محل" کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ وہ نہ تو ایسے ماہرین صحت تیار کرتے ہیں اور نہ اس قسم کی تحقیق کرتے ہیں جس کی معاشرے کو درحقیقت ضرورت ہوتی ہے۔ سینی گال میں ایک ڈاکٹر تیار کرنے پر پچاسی ہزار ڈالر، نائیجریا میں ۴۷ ہزار ڈالر اور پاکستان میں گیارہ ہزار ڈالر خرچ اٹھتا ہے۔ جو عوام کی آمدنی میں سے خرچ کیا جاتا ہے۔

جدید نوآبادتی معاشروں میں اشرافیہ غیر ملکی تعلیم پر جو زور دیتی ہے اسے کالجوں اور اسکولوں میں مسلمہ اقدار کی حیثیت سے روشناس کروایا جاتا ہے۔ مزید براں نیویارک یا لندن کے طے شدہ معیار جو بالعموم غیر ترقی یافتہ ممالک کے مسائل اور امکانات سے غیر متعلقہ ہوتے ہیں۔ طبی درسگاہوں میں لاگو کیے جاتے ہیں۔ جیسا کہ ایک ویسٹ انڈین مصنف کہتا ہے "موسیقی تو نیویارک میں بجتی ہے لیکن وہ افریقہ میں رقص کرتے ہیں۔"

میڈیکل کالجوں میں ایک پروفیسر جس نے اپنی پیشہ ورانہ مہارت امریکہ یا انگلستان میں حاصل کی ہے نہ صرف اپنے پیشے میں مسلمہ حیثیت کا حامل ہوتا ہے بلکہ سماج میں بھی اعلیٰ رتبہ رکھتا ہے۔ طالب علموں کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے مغرب سے

نیورولوجی یا امراض قلب میں مہارت حاصل کرنے کی تلقین کی جاتی ہے جبکہ ان کے اپنے ممالک میں اسی فیصد آبادی پیچش، تپ دق اور غذائی قلت سے نبرد آزما ہوتی ہے۔

تیسری دنیا کے پیشہ ور ماہرین طب بین الاقوامی حرکت پذیری MOBILITY یا تو بیرون ملک تعلیم کے ذریعے حاصل کرتے ہیں یا کسی مقامی ادارے میں ایسے نصاب کی تعلیم کے ذریعے حاصل کرتے ہیں جو ترقی پذیر ملک کے مقابلے میں کسی ترقی یافتہ ملک کے لیے موزوں ہو سکتا ہے پھر طبی مہارت کا حصول اموات اور اور امراض کی شرح کے مطابق ضرورت کے حساب سے نہیں ہوتا بلکہ غیر مساوی آمدنی کی دنیا میں منڈی کی قیمت MARKET VALUE کے حساب سے کیا جاتا ہے ایک ماہر امراض قلب جو بوسٹن میں تہرے بائی پاس آپریشن کی مہارت حاصل کرتا ہے کی طلب امراض قلب کا شکار ہونے والے لوگوں کو تو ہوگی (جو کہ آبادی کا صرف ۲ فیصد حصہ ہیں) جو اس کی اجرت ادا کر سکتے ہیں مگر وہ ماہر آبادی کے بقیہ حصے کی ضروریات سے مکمل طور پر نابلد اور بیگانہ ہوگا۔

مغربی ماڈل پر مبنی طبی تعلیم کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس سے وسیع پیمانے پر نقل مکانی یا دماغی قوت کا اخراج BRAIN DRAIN جنم لیتا ہے۔ اس صورت حال کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک طرف تو کوئی ملک اور اس کے عوام اپنے ڈاکٹروں کی تعلیم کا بندوبست اپنے خون پسینے کی کمائی سے کرتے ہیں اور وہی ڈاکٹر پہلے سے امیر مغربی ممالک کا رخ کرتے ہیں جنھیں اپنے ماہرین کو تربیت دینے کے خرچے میں بے حساب بچت ہوتی ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۱۹۷۱ء میں ترقی پذیر ممالک سے پانچ ہزار سات سو چھپن ڈاکٹروں کے آنے سے ہونے والی بچت امریکہ کے ۱۲۰ میڈیکل کالجوں کی سالانہ پیداوار کے نصف کے برابر تھی۔ اسی طرح ۱۹۷۱ء کے

دوران ڈاکٹروں کے امریکہ چلا جانے سے لاطینی امریکہ کے ممالک کو ہونے والے نقصان کا تخمینہ دو سو ملین ڈالر لگایا گیا ہے۔

بین الاقوامی پیمانے پر نقل مکانی کا سوال اس لیے اہمیت رکھتا ہے کہ اس سے کسی مخصوص نظام صحت اور اس سماجی و معاشی صورت حال کی عکاسی ہوتی ہے جس میں وہ نظام کام کرتا ہے۔ اس بین الاقوامی حرکت سے پیدا ہونے والے مسائل کا حل بذات خود اس حرکت میں مضمر نہیں ہے بلکہ کسی مخصوص قومی نظام صحت کے ڈھانچے اور یقیناً اس کے سیاسی، سماجی اور طبقاتی ڈھانچے میں لازمی تبدیلیوں میں مضمر ہے چونکہ دماغی قوت کے اخراج کا مظہر پیشہ وارانہ مہارت کے بین الاقوامی منڈی میں مربوط ہونے کا عکاس ہے اس لیے اس سے نمٹنے کی واحد صورت اس منڈی سے نجات میں ہے۔ افرادی قوت کی ترقی پزیر ممالک کے ماحول کے مطابق تیاری اور تربیت کا نتیجہ لازماً یہ نکلے گا کہ وہ تربیت یافتہ افرادی قوت ترقی یافتہ ممالک کے ماحول کے لیے ناکارہ ہوگی اور اس طرح نقل مکانی میں کمی کا باعث بنے گی۔

شہری تعصبات

تعلیم و تربیت کے مروجہ نظام کے تحت شہروں میں ہسپتالوں یا نجی طور پر میڈیکل پریکٹس کی خواہش دیہی طبی مراکز اور پبلک ہیلتھ ورک کے کھنڈروں پر اجاگر ہوتی ہے "شہری تعصب" کی اصطلاح ماہرین معاشیات و سماجیات معاشی اور سماجی وسائل کی اس تقسیم کے لیے استعمال کرتے ہیں جس کے تحت یہ وسائل دیہاتوں سے چھین کر شہروں کو مہیّا کیے جاتے ہیں۔ صرف معاشی مواقع ہی نہیں بلکہ تعلیم، صحت، سوشل سروس، تفریح وغیرہ کا تمام تر رخ شہروں کی طرف ہے۔ وجوہات کئی ہیں اور

بالکل واضح ہیں۔ سرکاری نوکرشاہی تیسری دنیا میں زیادہ تر شہروں میں رہتی ہے۔ صنعتی ترقی کی بڑھتی ہوئی شرح (اور یہ ترقی بھی شہروں میں ہوتی ہے) کے نتیجے میں وجود میں آنے والا سرمایہ دار طبقہ بھی شہر ہی میں رہتا ہے جن کے مطالبات پورے ہونا لازمی ہیں لہٰذا ریاست جو کہ "موجودہ توازن" برقرار رکھنے کے لیے کوشاں ہوتی ہے انھیں خوش رکھنے کی کوشش میں شہری علاقوں کو بہترین سہولیات فراہم کرتی ہے پھر شہری مزدور طبقے کا وجود جو کہ ایک عوامی سیاسی قوت بننے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اسے بھی قابو میں رکھنا ہوتا ہے۔

چلی کے ماہر معاشیات نے حساب لگایا ہے کہ لاطینی امریکہ میں اعلیٰ سہولتوں سے لیس ہسپتالوں میں صرف کیے جانے والے ہر ڈالر کی قیمت سو زندگیاں ادا کرتی ہیں اگر یہ پیسہ آبادی کو صاف پانی اور خوراک کی فراہمی پر خرچ کیا جاتا تو ایک ڈالر کے بدلے سو زندگیاں بچائی جا سکتی تھیں۔ کولمبیا میں بوگوٹا نامی جگہ پر اوپن ہارٹ سرجری کے تین یونٹ ہیں جو کہ ۲۰ لاکھ کی آبادی کے لیے ہیں ان تینوں یونٹوں کا سالانہ خرچ اتنا ہے کہ اس سے بھوک زدہ آبادی کے بچوں کی چوتھائی تعداد کو ایک سال تک آدھا لیٹر دودھ روزانہ مہیا کیا جا سکتا ہے۔

پچھلے چند سالوں سے "پرائمری ہیلتھ کیئر" یعنی صحت کی بنیادی سہولتوں کے تصور کے بارے میں بہت کچھ کہا جاتا رہا ہے۔ ۱۹۷۸ء میں عالمی ادارۂ صحت نے الماتا کانفرنس میں ۲۰۰۰ء تک تمام لوگوں کو صحت کی سہولت فراہم کرنے کا اعلان کیا جس کے تحت نہ صرف معالجاتی سہولتیں فراہم کی جائیں گی بلکہ احتیاطی تدابیر اور انسدادی طب کی سہولتیں بھی مہیا کی جائیں گی۔ اس اعلان سے پی ایچ سی یا پرائمری ہیلتھ کیئر کا تصور ابھر کر سامنے آیا۔ مختلف لوگوں نے اس کی تعریف مختلف طرح سے کی ہے، لیکن بنیادی بات یہی ہے کہ ۲۰۰۰ء تک تمام آبادی کو صحت کی سہولتیں

فراہم کی جائیں گی۔

پی ایچ سی کا تصور صرف صحت اور طب ہی کا مسئلہ نہیں بلکہ اس کے اہم سماجی، معاشی اور منہاجیاتی مضمرات ہیں۔ آبادی کی سماجی اور معاشی، جنسی اور سیاسی تفریق سے بالاتر ذمہ داریوں کے اشتراک کا دوسرے لفظوں میں مطلب یہ بنتا ہے کہ فعال اجتماعی بحث و مباحثہ، شرکت اور تنظیم یعنی خود حکومتی ڈھانچے میں انتظامی اختیارات کو غیر مرتکز کرنا "عوامی رجحان" رکھنے والی ہیلتھ پالیسی اور نظامِ صحت ایک ایسا آلہ بننے کی اہلیت رکھتی ہے جس کے ذریعے سماجی، معاشی اور سیاسی تبدیلیاں لانا آسان ہوگا جس کے نتیجے میں استحصال زدہ عوام کو معاشرے میں ان کا جائز حق مل سکے۔

اس سوچ کی بنیاد سادہ، کم قیمت، معالجاتی اور احتیاطی و انسدادی ہیلتھ سروس کی منصوبہ بندی کے قیام اور برقراری میں دیہی عوام کی شمولیت پر ہے۔ اس کے لیے ایسے کارکنوں کی ضرورت ہے جو (i) اپنے اردگرد لوگوں کو صحت اور صحت سے متعلق مسائل پر متحرک و مطلع کر سکیں (ii) اپنے اردگرد لوگوں کو بہتر اور صحت مند فضا بنانے کے لیے منظم کر سکیں مثلاً صفائی کی سہولتیں بہتر بنانے کے لیے (iii) شدید بیماریوں اور امراض کو شناخت کر سکیں اور انھیں ہسپتالوں میں بھیج سکیں اور چھوٹی موٹی بیماریوں کا خود علاج کر سکیں۔

پی ایچ سی کو تیسری دنیا کے موجودہ طبقاتی ڈھانچے میں شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ دیہات کی سطح پر حکمران اشرافیہ بالخصوص گاؤں کا سردار اختیار اور ذمہ داری کو کسی گروپ یا اجتماعی شکل کو سپرد کرنے پر قطعی رضامند نہ ہوگا۔ مرد خواتین کو کسی فیصلہ کرنے کے عمل میں شریک کرنے سے ہچکچائیں گے۔ اسی طرح مالک کسان بے زمین کسانوں کو شریک کرنے پر رضامند نہ ہوں گے۔

دیہات کی سطح سے اوپر ایک عام رجحان جو اربابِ اختیار میں پایا جاتا ہے وہ دیہی اشرافیہ کو مضبوط بنانے کا ہے اور محروم و غریب عوام کی ضروریات کو مدنظر رکھنے کا ہرگز نہیں ہے۔

سوشلزم اور صحت

اب تک ہم نے تیسری دنیا کے دست نگر سرمایہ دار ممالک کے تناظر میں صحتِ عامہ کے مسائل پر بحث کی ہے اب ہم سوشلسٹ ممالک پر ایک مختصر نظر ڈالتے ہیں کہ آیا غیر سرمایہ دارانہ طریقۂ پیداوار کوئی بہتر ثمر لا سکا ہے یا نہیں۔

موزمبیق نے دس سالہ طویل جنگ آزادی کے بعد پرتگال سے آزادی حاصل کی آزادی کے وقت ملک کا نظامِ صحت بہت خراب تھا پھر معاملات میں مزید پیچیدگی اس لیے بھی پیدا ہو گئی کہ ملک نے سوشلسٹ راہ چن لی۔ ملک کے ۸۰ فیصد ڈاکٹر ملک سے باہر بھاگ گئے۔ ایک کروڑ بیس لاکھ کی آبادی کے لیے صرف چار سو ڈاکٹر بچے اور وہ بھی سبھی شہروں میں مقیم تھے۔

حفظانِ صحت کے لیے پروگرام کی تشکیل اس اصول پر کی گئی کہ یہ سہولیات سارے ملک کے لیے ہوں اور صحت کے معاملات میں عوام کی اجتماعی اور جمہوری شمولیت لازمی ہو۔ حفاظتی ٹیکے لگانے کا پروگرام عالمی ادارۂ صحت کی مدد سے مکمل کیا گیا۔ وسیع پیمانے پر بیت الخلاء تعمیر کرنے اور صاف پانی کے استعمال کی عوامی مہمیں شروع کی گئیں سب سے ریڈیکل قدم طبی تعلیم کے نصاب میں تبدیلی کا تھا۔ نئی طبی تعلیم کا زور موزمبیق کے مسائل اور حالات پر تھا نہ کہ پرتگال کے حالات پر۔ امراضِ قلب کے بجائے بچوں کی بیماریوں اور حفاظتی اور احتیاطی طب پر زیادہ زور دیا گیا۔ اس سے نہ صرف عوام کی ضروریات پوری ہوئیں بلکہ عالمی منڈی کے لیے ڈاکٹر بھی کم قابلِ برآمد

ہو گئے۔ لہٰذا طبی عملے کا مغرب کی طرف اخراج بھی کم ہو گیا۔

مختصر عرصے کے لیے برسر اقتدار آنے والی چلی کی الینڈے (جو خود بھی ڈاکٹر تھے) حکومت نے ایسی اصلاحات کیں جو امریکہ کے بجائے چلی کے حالات کے مطابق تھیں صحت کے معاملات سے نمٹنے کے لیے محلہ کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔ تمام سطحوں پر صحت کے رضاکاروں کی شمولیت کے لیے حالات بہتر کیے گئے۔ یہاں بھی زیادہ توجہ بیماریوں کی جڑ (سیوریج کا غیر اطمینان بخش نظام اور پانی اور غذا کی کمی) کو ختم کرنے پر دی جاتی ہے نہ کہ صرف ہسپتال تعمیر کرنے پر۔ الینڈے حکومت کے ساتھ ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ، چونکہ انھوں نے ملک کا بنیادی نظام پیداوار تبدیل نہیں کیا تھا اس لیے صورت حال یہ بن گئی کہ ایک سوشلسٹ رجحان رکھنے والی ہیلتھ پالیسی کو بنیادی طور پر سرمایہ دارانہ نظام سے نبرد آزما ہونا پڑا اور اسے مختلف سطحوں پر مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ مجموعی طور پر چلی کا تجربہ ظاہر کرتا ہے کہ حفظان صحت میں اصلاحات سماجی نظام میں تبدیلی کے بغیر بے معنیٰ ہو کر رہ جاتی ہیں۔

چین اور اسی طرح کیوبا میں آزادی کے بعد امراض کی بیخ کنی کرنے کی مثبت پالیسی پر عمل کیا گیا۔ اعلیٰ درجے کے تربیت یافتہ ڈاکٹروں کے بجائے درمیانے درجے کے کارکن پیدا کرنے پر زور دیا گیا۔ عوامی مہموں کی مدد سے احتیاطی اور انسدادی تدابیر ان کے پروگراموں کا مرکزی نکتہ تھیں۔ بہت سے رضاکاروں کو دیہات میں بھیجا گیا اور دیہی طبی مراکز تشکیل دیے گئے۔ ننگے پاؤں والے ڈاکٹروں نے چین میں ڈاکٹروں کی تعداد دوگنی کر دی۔ منصوبہ بند پیداواری نظام کے باعث عوام کی حقیقی ضروریات پوری کرنے والا نظام صحت تشکیل دینے کی راہ میں حائل رکاوٹیں عبور کر لی گئیں۔ اِن اقدامات کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ کیوبا ان بیشتر امراض سے پاک ہے جو دنیا بھر میں عام ہیں۔ ۱۹۵۰ء میں شروع ہونے والی چینی پالیسی پرائمری ہیلتھ کیئر

کے اس تصور کی بنیاد بنی جو ۱۹۷۸ء میں عالمی ادارۂ صحت نے اپنایا۔

سیاسی مسئلہ

اب تک یہ واضح ہو چکا ہوگا کہ حفظانِ صحت کا مسئلہ ایک سیاسی مسئلہ ہے۔ نہ کہ وسائل کی کمیابی کا۔ نوکر شاہی اور اشرافیہ معاشرے کے صرف ایک حصّے کی بہتری کے لیے فیصلے کرتے ہیں۔ آزاد منڈی کے نظریے کے تحت طبی اور حفظانِ صحت کی سہولیات تک پہنچ ہونا عوام کا حق ہونے کی بجائے ایک عیاشی بن جاتا ہے کیوبا، چلی اور دوسرے سوشلسٹ ممالک کی مثالیں ظاہر کرتی ہیں کہ پسماندگی کی دنیا میں انسانی صحت کی سہولتوں کی منصفانہ تقسیم کے لیے مساوات پر مبنی نظام معیشت اور معاشرت قائم کرنا ضروری ہے جب تک دنیا کے غریب ترین ممالک کے سماجی اور ملکیتی تعلقات کو تبدیل نہیں کیا جاتا تب تک ان کے صحت کے معیار بلند نہیں ہو سکتے جب تک ذرائع پیداوار اور شعبۂ صحت میں کھپت پر بوژروازی کا کنٹرول رہے گا جسے مغرب سے ہر تازہ ترین شے حاصل کرنے کا جنون سوار ہے اس وقت تک ۲۰۰۰ء تک تمام شہریوں کو حقیقی موثر اور فعال حفظان صحت کی سہولتیں فراہم کرنے کا ارادہ خواب رہے گا۔

عالمی اجارہ داریاں اور پاکستان

ندیم خالد

عالمی اجارہ داریوں کی پیدائش اور نشوونما

انیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے ابتدائی سال آزاد مقابلے کی سرمایہ داری کے خاتمے کے سال تھے۔ نت نئی سائنسی ایجادوں نے سرمائے کے ارتکاز اور پیداواری مرکزیت کو نئے دور سے روشناس کروادیا۔ اسٹیل کی پیداوار میں نئے طریقوں کا استعمال، ٹربائن و ڈیزل انجن کی ایجاد، بجلی کا صنعت میں استعمال اور خودکار مشینوں کا روزافزوں بڑھتا ہوا رول وغیرہ وہ ایجادات تھیں جنھوں نے سرمایہ داری نظام کے صنعتی ڈھانچے میں نمایاں تبدیلیاں لانے میں کلیدی کردار ادا کیا اور پیداوار دیوہیکل کارخانوں میں مرتکز ہونے لگی۔ بڑے پیمانے کی پیداوار کے لیے زیادہ سرمائے کی ضرورت پڑی تو جوائنٹ اسٹاک کمپنیاں اور مالیاتی وجود میں آئے۔ ساتھ ہی ساتھ ان اجارہ دار سرمایہ داروں کے بیچ مقابلے نئے پیچیدہ شکل اختیار کی اور منافع میں کمی، دیوالیہ پن اور اشیاء کو منڈی میں بیچنے میں مشکلات نے سرمایہ داروں کو آپس میں سمجھوتوں اور اتحاد پر مائل کیا۔ آزاد مقابلے کا اس طرح اجارہ داریوں میں تبدیل ہونا اس کی اندرونی جدلیات کا لازمی نتیجہ تھا۔ ان اجارہ داریوں نے کارٹیل، سنڈیکیٹ، ٹرسٹ اور گروپ کی شکل اختیار کی۔ مثلاً امریکہ کی آٹوموبائیل صنعت میں انیسویں صدی کے آخر تک ۱۵۰۰ کمپنیاں تھیں۔ جبکہ اب ان میں سے صرف ۱۰ کمپنیاں باقی ہیں۔ تین بڑی کمپنیاں فورڈ، جنرل موٹرز اور کرائسلر جو ۱۹۰۹ء میں آٹوموبائیل کی صنعتی پیداوار میں ۴۲ فیصد حصے کی مالک تھیں ۱۹۷۳ء میں ۹۸ فیصد حصے کی مالک بن گئیں۔

دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر سامراجی معاشی ڈھانچے میں گہری تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کا سبب ایک طرف تو سائنسی تیکنیکی انقلاب تھا اور دوسری طرف عالمی سطح پر دو نظاموں کے درمیان طاقت کا نیا توازن اور نوآبادیاتی نظام کا خاتمہ تھا۔ سرمایہ دار ممالک کی بڑھتی ہوئی پیداوار کے لیے ملکی منڈیاں اور ذرائع ناکافی تھے خصوصاً امریکی اجارہ داروں کی مالی حیثیت دوسری جنگ عظیم کے دوران مضبوط ہوئی جبکہ یورپی ممالک اس دوران معاشی اعتبار سے بری طرح تباہ ہو چکے تھے اور ایک طاقتور بورژوازی کی عدم موجودگی میں یہ خطرہ پیدا ہو چلا تھا کہ ان ممالک میں سماجی انقلاب برپا نہ ہو جائیں۔ اس موقع پر امریکی حکومت اور اجارہ دار آگے بڑھے اور مارشل پلان کے نام پر ان ممالک میں زبردست سرمایہ کاری کی۔ مقامی سرمایہ دار کو حصہ دار بنایا گیا کیونکہ وہ مقامی حالات سے بہتر طور پر نبرد آزما ہو سکتا تھا۔ اس طرح اس دور کی نمایاں خصوصیت اجناس کی بجائے سرمائے کی برآمد تھی۔

دوسری طرف ایسے نوآزاد ممالک کی تلاش شروع ہوئی جہاں سرمائے کی قلت تھی، خام مال سستا اور اُجرتیں نیچی تھیں۔ اپنی حکومتوں کی مدد سے جوان نو آزاد ممالک کو عالمی سرمایہ دارانہ نظام میں کھینچنے کی خواہش مند ہوتی ہیں۔ اجارہ دار کمپنیوں نے وسیع ذرائع کا مالک ہوتے ہوئے ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ممالک میں براہِ راست سرمایہ لگایا

بین الاقوامی کارپوریشن کی اصطلاح پہلے پہل دوسری جنگ عظیم کے آخر میں ان کمپنیوں کے لیے استعمال ہونا شروع ہوئی جن کی آمدنی کا بڑا حصہ برآمدات سے حاصل ہوتا تھا اور بعد میں ان فرموں کے لیے استعمال ہونے لگی جو کہ بیرونی ممالک میں موجود اپنی شاخوں سے اندرون ملک سے زیادہ آمدنی حاصل کرنے لگے اور جن کی بیرون ملک سرمائے کی کمیت زیادہ تھی۔ اجارہ دار کی قومی شناخت ختم ہوتی گئی اور بیشتر سرمایہ دار ممالک کی اندرونی و بیرونی پالیسیاں انھی کے احکامات

پر مرتب ہونے لگیں اور وہاں کی حکومتیں ان کے ہاتھ میں کھلونا بن کر رہ گئیں۔
آئی بی ایم کے صدر کے مطابق عالمی کارپوریشن میں مندرجہ ذیل پانچ خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

(۱) کارپوریشن کی دو یا تین سے زائد ممالک میں موجودگی جو ترقی کے مختلف مدارج پر واقع ہوں (۲) صنعتی پیداوار اور معیشت کے دوسرے شعبوں میں اس کی شاخیں (۳) مقامی لوگوں کی شمولیت جو مقامی حالات سے بہتر طریقے سے نبرد آزما ہو سکتے ہوں۔ (۴) کارپوریشن کے مرکز میں مختلف ممالک کے نمائندوں کی شرکت (۵) شیئرز کا اجراء۔

عالمی پیداوار میں ان اجارہ دار کمپنیوں کا حصہ ایک چوتھائی کے برابر ہے ۱۹۶۸ء میں صرف جنرل موٹرز کا TURNOVER اقوام متحدہ کے ۱۲۶، ارکان ممالک میں سے ۱۱۲، ممالک کی مجموعی قومی پیداوار سے زیادہ تھا۔

عالمی اجارہ دار اور ترقی پزیر ممالک میں انکی حکمت عملی

پچھلے پندرہ بیس سال کے دوران عالمی اجارہ دار ترقی یافتہ ممالک میں سرمایہ کاری کو ترجیح دیتے رہے ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں ترقی یافتہ اور ترقی پزیر ممالک میں اُن کی سرمایہ کاری کا تناسب بالترتیب ۶۹ اور ۳۱ فیصد تھا جو ۱۹۷۹ء میں ۷۵ اور ۲۵ فیصد ہو گیا۔ ترقی پذیر ممالک کو کم اہمیت دینے کی وجہ ان ممالک کی اندرونی منڈیوں کا محدود ہونا، تربیت یافتہ کارکنوں کی کمی، نقل و حرکت کے ذرائع کی پسماندگی اور سیاسی و معاشی صورت حال کا غیر مستحکم ہونا ہے جبکہ کچھ خاص ممالک کے بارے میں یہ صورت حال مختلف ہے۔ عالمی اجارہ داریاں اپنا سرمایہ لگاتے ہوئے ان ممالک کا انتخاب کرتی ہیں جو وسیع اندرونی منڈی رکھتے ہوں بہترین قدرتی وسائل کے مالک ہوں اور جغرافیائی لحاظ سے فائدہ مند ہوں۔ ایسے ممالک کو نظر انداز کیا جاتا ہے جنھیں سمندر نہ لگتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی

اجارہ داروں کا سرمایہ ۱۱۹، ترقی پذیر ممالک میں سے صرف ۱۰ میں مرتکز ہے۔
امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک کی اجارہ داریاں صنعت کے ایسے شعبوں میں سرمایہ لگاتے ہیں جو مغربی صنعتی مرکز کے تابع ہوں، جہاں زیادہ محنت طلب کام کم اجرت پر حاصل کیا جا سکے اور کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کیا جا سکے۔ اجارہ داروں کے ان تمام تر ہتھکنڈوں کا نتیجہ ترقی پذیر ممالک کے معاشی طور پر پسماندہ رہنے میں نکلتا ہے اور ان صنعتی شاخوں کو پھلنے پھولنے کا موقع نہیں ملتا جو ان ممالک کو ترقی کی راہ پر گامزن کر سکیں۔ یہ ہے محنت کی عالمی تقسیم کا عملی پہلو۔

اجارہ داروں کی ان تمام خواہشات پر برازیل جیسا ملک پورا اترتا ہے جس کی حکومت ان کو بے پناہ رعائتیں مہیا کرتی ہے۔ ٹیکس سے چھوٹ، نفع کو ملک سے باہر لے جانے کی مکمل آزادی اور سیاسی تحفظ وہ وجوہات ہیں جن کی بنا پر برازیل میں لگنے والا امریکی سرمایہ تمام ترقی پذیر ممالک میں لگنے والے سرمائے کا بیس فیصد ہے۔ ترقی پذیر ممالک کی ترقی کی رفتار سست ہونے کا سبب یہ ہے کہ جتنا سرمایہ اس کی معیشت سے نفع کی شکل میں لے جایا جا رہا ہے اتنا اس میں لگایا نہیں جا رہا صرف ۸۔۱۹۷۰ء کے درمیان امریکہ نے بیرونی ممالک میں ۳۷.۵ بلین ڈالر کی سرمایہ کاری کی جن میں سے صرف ۲۳ فیصد سرمایہ کاری ترقی پذیر ممالک میں ہوئی جبکہ امریکہ منتقل ہونے والے منافع کا ۴۷ فیصد حصہ انھی ممالک سے لیا گیا۔ اس عرصے میں ترقی پذیر ممالک میں ۸.۶ بلین ڈالر کی سرمایہ کاری کی گئی جبکہ یہاں سے ۲۹.۷ بلین ڈالر کا منافع کمایا گیا۔ یعنی ترقی پذیر ممالک میں لگائے جانے والے ایک ڈالر پر ۳.۵ ڈالر کا منافع ہوا۔ البتہ ترقی یافتہ ممالک میں ہونے والے منافع کی بڑی رقم کو انھی ممالک کی معیشت میں رہنے دیا گیا۔

ٹرانس نیشنل کارپوریشنز نے ترقی پذیر ممالک کی خام اشیاء کی برآمد کو بھی مکمل طور پر اپنے قبضے میں لے رکھا ہے جیسا کہ کیلا، چاول، ربڑ، خام تیل کی ۷۵

فیصد، ٹن کی ۸۰ فیصد، تمباکو، کافی، چائے، گندم، کپاس، جوٹ اور ٹمبر کی ۹۰ فیصد اور لوہا اور باکسائٹ کی ۹۵ فیصد برآمد کو یہ کمپنیاں کنٹرول کرتی ہیں جن ممالک کو یہ اشیاء بھیجی جاتی ہیں وہاں بھی انھی کمپنیوں کی برانچیں انھیں درآمد کرتی ہیں ایسی تجارت سے اجارہ داروں کو قیمتیں متعین کرنے میں آسانی ہوتی ہے اور ٹیکس کسٹم وغیرہ کے بکھیڑوں سے بچا جاتا ہے۔ ایسی تجارت دنیا کی کل تجارت کا ۳۰-۴۰ فیصد حصہ ہے۔ ۷۰-۱۹۶۴ء کے دوران سامراجی طاقتوں نے ترقی پذیر ممالک کو برآمد کی جانے والی اشیاء کی قیمتوں میں ۱۷ فیصد اضافہ کیا جبکہ ان ممالک سے برآمد ہونے والی خام اشیاء کی قیمتیں صرف ۷ فیصد بڑھیں۔ صرف پانچ سال میں ایسی تجارت سے نقصان کا تخمینہ ۱۰ ارب ڈالر لگایا جاتا ہے۔ ایک پاکستانی وزیر زراعت کے مطابق ۱۹۶۱ء میں ہمیں ایک ٹریکٹر کے لیے جتنی پٹ سن دینی پڑتی تھی اب ۱۹۷۱ء میں اس سے تین گنا زیادہ دینی پڑتی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک نہ صرف سستے داموں خام اشیاء حاصل کرتے ہیں بلکہ اکثر اوقات یہاں کی تیار کردہ اشیاء کی درآمد پر سخت پابندیاں عائد کر دیتے ہیں۔ مثلاً ۱۹۷۷ء میں یورپی منڈی نے فیصلہ کیا کہ وہ ۳۲ ترقی پذیر ممالک سے ٹیکسٹائل اشیاء کی درآمد میں شدید کمی کر دیں گے۔ ان تمام درآمدی اشیاء پر بڑے بڑے ٹیکس لگا دیے گئے جو ویسے ہی مغرب کا مقابلہ مشکل سے کر پاتی ہیں۔ ۱۹۷۷ء میں امریکہ نے لاطینی امریکہ کی جانب سے برآمد کی جانے والی اشیاء پر ٹیکسوں میں ۵۰ فیصد اضافہ کر دیا۔ عالمی سطح پر ہونے والی تمام تر تجارت میں رقومات کی ادائیگی سامراجی بنکوں کے ذریعہ کی جاتی ہے جو اس لوٹ کھسوٹ میں اپنا حصہ لیتے ہیں۔

سامراجی ممالک تیسری دنیا کو جو صنعتی ساز و سامان اور ٹیکنالوجی فراہم کرتے ہیں اس کی منہ مانگی قیمت وصول کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایسی مشینری فراہم کرنے سے انکار کر دیا جاتا ہے جو ملک کو خود کفیل بنانے میں مدد دے۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی پذیر ممالک کے لیے بنیادی اہمیت رکھنے والی بھاری صنعت کی ترقی کو

مکمل طور پر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ترقی پزیر ممالک پر سامراجی اثر و نفوذ قائم رکھنے کا ایک ذریعہ انھیں مدد دینا ہے۔ ۷۷-۱۹۷۰ء کے دوران ترقی پزیر ممالک کو ۸۵.۷ بلین ڈالر کی رقم قرض پر دی گئی۔ امریکی کانگریس کے اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۷۰ء میں امریکہ نے جو امداد فراہم کی اس کا ۶۰ فیصد فوجی مدد کی صورت میں ۳۰ فیصد پولیس کو جدید آلات کی فراہمی پر اور بقیہ ۲۰ فیصد ترقیاتی منصوبوں پر خرچ کیا گیا۔

تجربہ بتاتا ہے کہ سامراجی ممالک کی مدد نے ترقی پزیر ممالک کی ترقی میں کوئی خدمت انجام نہیں دی الٹا ترقی یافتہ اور ترقی پزیر ممالک کے درمیان معاشی ترقی کا فرق بڑھتا ہی جا رہا ہے مدد دیتے وقت یہ شرط بھی عائد کی جاتی ہے کہ اس رقم کا بڑا حصہ مدد فراہم کرنے والے ملک میں اشیاء خریدنے پر خرچ کیا جائے گا۔ مدد کی رقم پر خریدی جانے والی اشیاء کی قیمت نسبتاً زیادہ رکھی جاتی ہے۔ اس طرح سامراج دوگنا نفع حاصل کرتا ہے ۱۹۷۸ء کے آخر تک ترقی پزیر ممالک پر قرضوں کی رقم ۳۰۰ بلین ڈالر سے تجاوز کر گئی تھی جس نے اس کی واپسی کے لیے بے پناہ مشکلات پیدا کر دیں۔ ایک فرانسیسی رسالے کے مطابق امریکہ کسی ایک ملک کا حوالہ حوالہ نہیں دے سکتا جہاں اس کی مدد سے سماجی حالات بہتر بنانے میں مدد ملی ہو۔

سامراجی استحصال کو شدید سے شدید تر کرنے کے لیے اجارہ داروں کی مدد کو بہت سے خصوصی ادارے آن موجود ہوتے ہیں۔ عالمی مالیاتی فنڈ جو کہ ترقی پزیر ممالک کی دوستی کا دم بھرتے نہیں تھکتا کے ذمے یہ فرض ہے کہ وہ ترقی پزیر ممالک کی معیشت کو اس حد تک مستحکم بنائے کہ وہ قرضے واپس کرنے کا اہل ہو سکے اور اجارہ داروں کو زیادہ سے زیادہ منافع باہر لے جانے کا موقع حاصل ہو۔ ۱۹۷۷ء میں جب میکسیکو کو مدد کی ضرورت پڑی تو عالمی مالیاتی فنڈ کی جانب سے عائد کی جانے والی شرائط مندرجہ ذیل تھیں۔ مزدوروں کی اجرتیں کم کی جائیں، ۱،

ریاستی سیکٹر کی ترقی میں سرمایہ لگانا بند کیا جائے، صنعتی مشینوں کی درآمد محدود کی جائے اور مقامی و بیرونی سرمائے کو کھلی آزادی دی جائے۔ سابق امریکی صدر فورڈ نے ترقی پذیر ممالک کو دی جانے والی مدد کو ایسا معاشی اور سیاسی ہتھیار قرار دیا جو امریکی مفادات کے تحفظ میں اہم حیثیت کا حامل ہے۔ امریکی سامراج دنیا کے ہر کونے میں اپنا راج قائم کرنے کے لیے سرگرم عمل ہے۔ وہ دوسرے ممالک کے اندرونی مسائل میں مداخلت کرتا ہے اور اُن کے قانونی حقوق و سلامتی پامال کرتے ہوئے ریاستوں اور قوموں پر طاقت اور دباؤ کے ذریعے اپنی پالیسی نافذ کرتا ہے۔ امریکی مدد زیادہ تر ان پٹھو حکمرانوں کو دی جاتی ہے جو سامراج کے جارحانہ مقاصد کی تکمیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اسرائیلی صیہونیت پرستوں کو مہیا کی جانے والی امریکی مدد کا اولین مقصد مشرقِ وسطیٰ میں اپنی برتری قائم کرنا ہے۔

مغربی اجارہ داروں کے لیے منافع کا سب سے بڑا ذریعہ تیل کی دولت ہے۔ ۷۳-۱۹۶۰ء کے دوران صرف تیل کے کاروبار سے مغربی سرمایہ کاروں اور ان کی پشت پر کھڑی سامراجی حکومتوں نے ۱۰۰ ارب ڈالر کا منافع حاصل کیا جبکہ قدرتی وسائل سے مالا مال ملک بری طرح کی اقتصادی پسماندگی کا شکار ہیں۔ اور عوام بے حد غربت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان ممالک میں تیل کے ذخائر کی تلاش اور اس کے حصول پر لگنے والے ایک ڈالر کے سرمائے نے مغربی کمپنیوں کو ۱۴۴ ڈالر تک منافع دیا۔ علاوہ ازیں تیل کی درآمد پہ ہونے والے خرچ کو مختلف طریقوں سے واپس لے لیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایران ۱۹۷۸ء تک مغربی ممالک سے ۲۰ ارب ڈالر کا اسلحہ خرید چکا تھا جس سے مغربی ممالک کو تیل کی خرید پر خرچ کی جانے والی بیشتر رقم واپس مل گئی۔ گزشتہ چند برسوں سے اوپیک کی جانب سے اٹھائے جانے والے اقدامات سے تیل برآمد کرنے والے ملکوں کی آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے لیکن زیادہ تر ممالک اس سرمائے

کو استعمال کرنے کے اہل نہیں تھے جس کا فائدہ سامراجی ملک نے اس طرح اٹھایا کہ ۷۷-۱۹۷۲ء کے دوران صرف مغربی یورپ میں تیل برآمد کرنے والے ممالک نے ۵۰ ارب ڈالر کا سرمایہ لگایا۔ زیادہ تر ممالک میں قدامت پسند مغرب نواز حکومتیں سرمائے کو اپنی پسماندہ صنعت میں لگانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ سامراجی ممالک کی طرف سرمائے کا بہاؤ ترقی پزیر ممالک کے لیے بے شمار مشکلات کا باعث بن رہا ہے۔ ایرانی انقلاب کے بعد امریکی حکام کی طرف سے ایرانی سرمائے کو منجمد کرنا ان تمام ممالک کے لیے اہم سبق ہے۔

موجودہ دور میں ترقی پزیر ممالک کی سامراج دشمن تحریک نے اجارہ داروں کے سامنے بڑی مشکلات کھڑی کر دی ہیں جس کے نتیجے میں مغربی کمپنیوں کے طریقۂ واردات میں مختلف قسم کی تبدیلیاں دکھائی دیتی ہیں۔ ترقی پزیر ممالک کی معیشت پر قبضہ کرنے کے طریقوں میں ایک مقامی بورژوازی، سیاستدانوں، ریٹائرڈ فوجی و سول افسران کو اپنے کاروبار میں حصے دار یا اونچے درجوں پر ملازم بنانا ہے۔ اس طرح مقامی حکومت پر دباؤ کو بڑھایا اور ملک کی معاشی و سیاسی زندگی میں اپنے قدم مضبوط کیے جاتے ہیں۔ ایک دوسرا طریقہ ایسی ملی جلی کمپنیوں کا قیام ہے جس میں مقامی سرمائے کے علاوہ ریاستی سرمائے تک کو حصہ دار بنایا جاتا ہے۔ ایسی کمپنیوں کے قیام کا مقصد بیرونی اجارہ دار سرمائے کو قومیائے جانے کے خدشے کا خاتمہ، ٹیکسوں سے چھوٹ اور بہت سے ایسے اقدامات سے بچنے کے لئے جو کہ ترقی پزیر ممالک کی حکومتیں غیر ملکی سرمائے کو محدود کرنے کے لیے اٹھاتی ہیں۔ صرف ہندوستان میں ایسی کمپنیوں کی تعداد ۱۳۰۰ کے قریب ہے۔ بورژوا ماہرین معاشیات بھی یہ اعتراف کرنے سے نہیں گھبراتے کہ ایسی کمپنیوں کی مدد سے نو آزاد ممالک کا استحصال زیادہ ممکن ہے۔

قومیائے جانے کے خطرے نے ترقی پزیر ممالک میں مغربی کمپنیوں کے کارخانوں کی تعداد محدود کر دی ہے مگر منافع کی سطح برقرار رکھنے کے لیے

نو آزاد ممالک میں مغربی ماہرین بھیجے جاتے ہیں۔ یہ ماہرین جن کے لیے بہت بڑی رقم ادا کی جاتی ہے جلد ہی صنعت میں اپنی حیثیت مضبوط کر لیتے ہیں اور حکومت کو مخصوص کمپنیوں سے تجارت کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ ایسی کمپنیوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے جو صرف مشورے دیتی ہیں۔ جدید نو آبادیاتی استحصال کی ایک اور شکل مغربی ممالک سے غیر ملکی ماہرین کی درآمد ہے۔ ہر سال تقریباً ۳۰، ہزار اعلیٰ تعلیم یافتہ ماہرین اپنے ملک چھوڑ جاتے ہیں جس کی وجہ ماہرین کی تیاری میں منصوبہ بندی کا فقدان، کم اجرت اور مستقبل میں غیر یقینی ہے۔ ان ماہرین کے ملک سے باہر جانے کا نقصان ۲۰۰ ملین ڈالر سالانہ ہے جبکہ دوسرے نقصانات میں ملکی صنعتی ترقی کی رفتار میں کمی اور ملک کا ترقی یافتہ ممالک پر انحصار کا بڑھنا شامل ہے۔ مغربی ممالک ان ماہرین کی آمد سے بے شمار فوائد حاصل کرتے ہیں۔ امریکی کانگریس کی رپورٹ کے مطابق صرف ۷۲-۱۹۷۱ء میں امریکہ نے دوسرے ممالک کے ماہرین کی آمد سے ۲،۱ ارب ڈالر کی بچت کی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کو مغربی ممالک میں شہریت دینے میں خاص رعایت دی جاتی ہے۔ مثلاً امریکہ میں بسنے والے غیر ملکیوں میں ڈاکٹروں کی تعداد ۶۳ فیصد ہے۔

زیادہ سے زیادہ منافع کے حصول کو ممکن بنانے کے لیے اجارہ دار جس طرح معاشی ویسے ہی سیاسی ہتھکنڈوں کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ بہت سے ملکوں میں جہاں نسبتاً ترقی پسند قوتیں برسرِ اقتدار ہیں، فوجی بغاوتوں کو عملی جامہ پہنانا، بدنامِ زمانہ غیر عوامی حکومتوں کی مدد اور عوامی تحریکوں کو دبانے کے لیے ہر قسم کے وسائل فراہم کرنا ان اجارہ داروں کے نمایاں کرتوت ہیں۔ چلی میں ہونے والی فاشسٹ بغاوت میں امریکی سرمایہ داروں کے کردار کو پوری دنیا جانتی ہے۔ ۱۹۷۵ء میں یونائیٹڈ برانڈز اور اسٹینڈرڈ فروٹ نامی کمپنیوں نے پانامہ، کوسٹاریکا اور ہونڈوراس کی حکومتوں کو کمزور

کرنے کے لیے ۵۰ لاکھ ڈالر کا خصوصی مشترکہ فنڈ بنایا جن کی پالیسی اجارہ داروں کو ناپسند تھی۔ ہندوستان کو ضروری چیزوں کی فراہمی اس وقت بند کر دی گئی جب اس نے ویت نام میں امریکی بمباری کی مذمت کی۔ سری لنکا کو امریکی تیل کمپنیاں قومیانے پر ایسی ہی سزا بھگتنا پڑی۔ بنگلہ دیش کو گندم کی فراہمی اس وقت روک دی گئی جب اس نے کیوبا کو پٹ سن فروخت کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۱۹۴۸ء اور ۱۹۵۳ء میں پیرو، دینزویلا اور ایران میں تیل کی عالمی اجارہ داریوں کی شہ پر جمہوری قوتوں کا تختہ اُلٹ دیا گیا۔

ان تمام حقائق سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ عالمی سرمایہ داری نظام مٹھی بھر ترقی یافتہ ملکوں کے ہاتھ دنیا کی آبادی کے غالب اکثریت پر نوآبادیاتی ظلم اور ان کا مالیاتی طور پر گلہ گھونٹنے کا عالمی نظام بن چکا ہے۔ ترقی پذیر ممالک کی صنعتی پسماندگی کے باعث یہاں کے عوام کا معیار زندگی نہایت نیچا ہے یہاں سالانہ آمدنی کی اُوسط شرح ترقی یافتہ مغربی ممالک سے ۱۵-۱۷ گنا کم ہے اور اس فرق میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ مثلاً ملائشیا میں واقع ریڈیو الیکٹرک کارخانوں کا مزدور امریکہ میں واقع اسی قسم کے کارخانوں کے مزدوروں سے ۳۰ گنا کم اُجرت حاصل کرتا ہے۔ تقریباً ایک ارب لوگوں کی سالانہ آمدنی ۱۵۰ ڈالر فی کس سے بھی کم ہے اور ۳۰ کروڑ کی آمدنی اس سے آدھی بھی نہیں ہے۔ اس وقت ایک ارب لوگ پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھاتے اور ۴۷ کروڑ شدید قسم کی فاقہ کشی کا شکار ہیں جن میں ۴ کروڑ بچے بھی شامل ہیں۔ ترقی پذیر ممالک کے ۸۰ کروڑ لوگ ان پڑھ ہیں۔ ہر ملک میں بے روزگاروں کی پوری فوج موجود ہے۔ ۴۰ ترقی پذیر ممالک میں ۲۰ فیصد آبادی قومی آمدنی کا ۷۵ فیصد حاصل کرتی ہے جبکہ بقیہ ۸۰ فیصد صرف ۲۵ فی صد قومی آمدنی کے حقدار بنتے ہیں۔ پسماندہ ممالک کے مسائل کا مطالعہ کرنے والے سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ممالک کے درمیان

موجود فرق کو کم کرنے کے لیے ترقی پذیر ممالک کو سماجی پیداوار کی ترقی کی اوسط شرح ۱۰ - ۸ فیصد سالانہ بڑھانی پڑے گی جبکہ سرمایہ دارانہ راستے پر چلتے ہوئے ترقی کی ایسی رفتار ناممکن ہے۔ مثلاً انڈونیشیا میں فی کس قومی آمدنی کو اس سطح تک پہنچنے کے لیے جو کہ ۱۹۶۵ء میں امریکہ میں تھی ۵۹۳ سال درکار ہیں، کولمبیا کو ۸۵ ۲ نائیجریا کو ۳۳۹ اور ہندوستان کو ۱۱۷ سال کی ضرورت ہوگی۔

اِن حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے پچھلے چند برسوں میں بہت سے نو آزاد ممالک میں اہم داخلی اور بیرونی تبدیلیاں لائی گئی ہیں جس میں موزمبیق انگولا، ایتھوپیا، افغانستان، الجزائر اور متعدد دوسرے ممالک شامل ہیں اجارہ داروں کے استحصال سے نجات کے لیے بہت سے ممالک نے ریاستی شعبے کو ترقی دینا شروع کی اور بہت سی غیر ملکی کمپنیوں کو قومیالیا گیا۔ اقوام متحدہ کے اعداد و شمار کے مطابق ۷۴ - ۱۹۶۰ کے دوران ۶۰، ترقی پذیر ممالک میں قومیائے جانے کے ۸۷۵، واقعات ہوئے۔ متعدد ترقی پذیر ممالک اپنے قدرتی وسائل کو اجارہ داروں کے چنگل سے بچانے میں کامیاب رہے ہیں۔ تیل برآمد کرنے والے ممالک کی تنظیم اوپیک قومی مفادات کے تحفظ کے لیے موثر اقدامات اٹھا رہی ہے۔ اب تیل کوئی نوآبادیاتی جنس نہیں رہی۔ خود مختار ممالک کی طرف سے اپنے مفادات کے دفاع کرنے کی کوشش کو اجارہ دار قوم پرستی کہتے ہیں۔ یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ ترقی کا واحد ممکن راستہ اجارہ داریوں کے ساتھ تعاون میں ہے۔ اجارہ داروں کی جانب سے دی جانے والی مدد جو شروع میں معاشی مشکلات سے نکلنے کی راہ نظر آتی ہے ترقی پذیر ممالک کو زیادہ گہری معاشی مصیبتوں میں پھنسا دیتی ہے۔ ویسے بھی موجودہ دور میں طاقتور سوشلسٹ بلاک کی موجودگی نے ان قوموں کے سامنے ترقی کا غیر سرمایہ دارانہ راستہ بھی ممکن بنا دیا ہے۔ سامراج سے مقابلہ

کرنے کا ذمہ پرولتاریہ نے خود اپنے کاندھوں پر لے لیا ہے ۔ صرف وہ ہی ایک ایسی حقیقی طاقت ہے جو سامراج سے لڑنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے ۔ سرمائے کی دوسرے ممالک کو برآمد سے صرف ترقی پزیر ممالک کی پرولتاریہ ہی نقصان نہیں اٹھاتی بلکہ خود سامراجی ممالک میں ان اقدامات سے بے روزگاری میں اضافہ ہوا ہے ۔ پرولتاریہ اور صنعتی سرمایہ داروں کے درمیان تضادات شدت پکڑ رہے ہیں ۔ سامراجی قوتیں ایسی صورت حال سے بے حد خوفزدہ ہیں اور مزدور طبقے کی صفوں میں پھوٹ ڈالنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہیں ۔

دوسری طرف بہت سے ترقی پزیر ممالک کی طرف سے اٹھائے جانے والے اقدامات جن میں ریاستی سیکٹر کی ترقی ، فیوڈلزم کا خاتمہ ، غیر ملکی کمپنیوں کو قومیایا جانا ، قدرتی وسائل کو ریاستی کنٹرول میں لینا اور ملکی ماہرین کی تیاری شامل ہے ان ممالک کو تیزی سے ترقی کی راہ پر گامزن کر رہے ہیں ۔

ترقی پزیر ممالک میں عالمی اجارہ داریوں کی مجموعی حکمت عملی کا جائزہ لیتے ہوئے اب ہم پاکستان میں بیرونی سرمائے کے اثر و نفوذ کا جائزہ لیں گے ۔

پاکستان میں عالمی اجارہ داریوں کا کردار

پاکستانی معیشت میں بیرونی مفادات کا تعین محض عالمی اجارہ داریوں کی مجموعی سرمایہ کاری اور اس کے کردار سے نہیں ہوتا بلکہ مختلف مدوں میں دی جانے والی بیرونی امداد ، ملکی درآمدات کے ڈھانچے ، سرمایہ داری نظام کی عالمی تقسیم محنت میں اس کے مقام اور سیاسی اور جغرافیائی حالات سے ہوتا ہے اس لیے ہم اس مضمون میں نہ صرف عالمی اُجارہ داریوں کی سرگرمیوں کا احاطہ کرتے ہوئے مقامی سرمایہ دار سے اِن کے تعلقات کی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کریں گے بلکہ درآمدات میں بیرونی اجارہ داروں پر انحصار اور

ریاستی مشینری میں بیرونی مفادات کو قومی مفادات پر فوقیت دینے کی پالیسی کو بھی زیر بحث لائیں گے۔

مختصر تاریخ

تقسیم کے وقت پاکستان میں شامل ہونے والے علاقوں کی معیشت پر برطانوی سرمایہ حاوی تھا ———— معاشی اعتبار سے برطانوی ہندوستان کے یہ علاقے نسبتاً پسماندہ تھے اور ان میں برطانوی نجی سرمایہ کاری کچھ زیادہ نہیں تھی۔ مختلف اندازوں کے مطابق پاکستان کے وجود میں آنے پر یہاں بیرونی سرمایہ کاری ۱۰۰ ملین روپے سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن ان میں برطانوی کمپنیوں کے وہ اثاثے شامل نہیں ہیں جن کے ہیڈ کوارٹر ہندوستان میں واقع تھے۔

ہندوستانی سرمائے کا بھی مقامی معیشت میں کافی عمل دخل تھا، لیکن ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران انھیں ضبط کر لیا گیا۔ آزادی کے ابتدائی سالوں میں برطانوی سامراج کے اثر ورسوخ کو سرمایہ کاری کی مجموعی رقم سے اخذ کرنا درست نہ ہوگا بلکہ یہ برطانوی سرمائے کے مختلف شعبوں میں خصوصی دلچسپی، ملک کے اندر مضبوط تجارتی رشتے اور پاکستان کے سٹرلنگ زون میں شامل رہنے سے متعین ہوتا ہے۔

برطانوی سرمائے کا زیادہ تر حصہ تجارت اور کریڈٹ میں مرتکز تھا۔ برطانوی بنک بیرونی تجارت کے ۲/۳ حصے اور اندرونی تجارت کے بیشتر حصے کو کنٹرول کرتے تھے۔ انشورنس کمپنیاں بھی برطانوی سرمائے کے کنٹرول میں تھیں۔ کریڈٹ اور فنانس میں برطانوی سرمایہ کاری نہ صرف منافع کی اونچی شرح کو ممکن بناتی تھیں بلکہ ملکی معیشت پر موثر کنٹرول کا ذریعہ بھی تھیں۔ برطانوی سرمایہ معیشت کے زیادہ ترقی یافتہ شعبوں پر قابض تھا جن میں ایندھن کو حاصل اور تیار کرنا، خورد ونوش کی اشیاء پٹ سن کی صنعت، چائے

کے باغات اور بحری و دریائی ٹرانسپورٹ شامل تھیں۔

برطانوی سرمائے کو دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں بہت سی اضافی رعائتیں حاصل تھیں۔ ۱۹۵۸ء تک پاکستان میں ہونے والی نئی بیرونی سرمایہ کاری میں برطانیہ کا حصہ ۹۰ فیصد تھا جو کہ نجی سرمائے کی شکل میں تھا جبکہ تقسیم کے چند سال بعد ہی بیرونی سرمایہ اقتصادی مدد کی نسبتاً نئی شکل میں بھی داخل ہونے لگا۔ ۱۹۵۱ء سے کولمبو پلان کے تحت برطانیہ کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ سے پاکستان کو اقتصادی مدد ملنا شروع ہوئی۔ ۵۳-۱۹۵۲ء میں امریکی امداد بھی ملنا شروع ہوئی جس نے چند ہی سالوں میں دوسرے سرمایہ دار ممالک کو اس میں پیچھے چھوڑ دیا۔ ۱۹۵۶ء کے اختتام تک ریاستی ذریعوں سے امریکہ سے موصول ہونے والی رقم مجموعی مدد کا ۷۵ فیصد حصہ تھی۔ اسی عرصے میں حکمران طبقوں میں بھی امریکہ اور برطانیہ کی رقابت کا اظہار شدید طریقے سے ہونے لگا۔ برطانیہ کی معاشی بدحالی اور امریکہ کے سیاسی و معاشی اثر و رسوخ میں اضافے نے مقامی حکمران طبقات کو اپنے نئے آقا کی تلاش میں مدد دی، لیکن ایوب خان کے اقتدار پر قابض ہونے سے پہلے امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک کی نجی سرمایہ کاری کی رفتار بہت سست تھی جس کی ایک وجہ تو سیاسی اقتدار میں عدم استحکام میں اور دوسری برطانوی لابی کا ہنوز کافی مضبوط ہونا تھا۔

۱۹۵۸ء کے فوجی انقلاب کے بعد بیرونی سرمائے میں قابلِ قدر اضافہ ہوا، سیاسی اقتدار کا مستحکم ہونا، حکمران طبقوں کی طرف سے نجی سرمائے کی مکمل حوصلہ افزائی اور چند بورژوا اصلاحات کی وجہ سے نہ صرف پاکستانی بورژوازی کو تقویت ملی بلکہ بیرونی سرمایہ کاری میں بھی اضافہ ہوا صرف ۶۸-۱۹۵۸ء میں نجی بیرونی سرمایہ کاری ۵ء۱ بلین روپے سے بڑھ کر تین بلین روپے ہو گئی جبکہ پچھلے دس سالوں کے مقابلے میں بیرونی نجی سرمائے

کے سالانہ اوسط اضافے میں تین گُنا اِضافہ ہوا۔ ریاستی قرضوں میں اضافے کی شرح اس سے بھی زیادہ تھی۔

۱۹۶۰ء میں IBRD کی پہل کاری پر پاکستان کو مدد دینے والے ممالک پر مشتمل کنسورشیم قائم ہوا جس میں امریکہ، برطانیہ، مغربی جرمنی، جاپان، کینیڈا، فرانس، اٹلی، بلجیئم، عالمی بنک (IMF) عالمی مالیاتی فنڈ اور فورڈ فاؤنڈیشن شامل ہیں۔ پاکستان کو ملنے والے مجموعی قرضے اور معاشی مدد کا ۹۰ فیصد حصّہ اسی کنسورشیم کے ذریعے ملنے لگا۔ ۱۹۶۹ء تک بیرونی قرضوں کی مجموعی رقم ۶ بلین ڈالر تک پہنچ گئی۔ بیرونی قرضوں کی اِس یلغار کا تعلق پاکستان کے ترقیاتی منصوبوں کو سرمایہ فراہم کرنا تھا تاکہ معاشی سرگرمیوں کے لیے لازمی ذرائع نقل و حمل INFRASTRUCTURE مواصلات اور توانائی کے شعبوں کو ترقی دی جا سکے جو عالمی اجارہ داروں کے لیے بہت اہم تھیں۔ بیرونی مدد کے ذریعے دوسرے پانچ سالہ منصوبے کے ترقیاتی منصوبوں کے لیے ۵۹ فیصد اور تیسرے پانچ سالہ منصوبے میں ۴۵ فیصد سرمایہ مہیّا کیا۔

ایوب حکومت نے اپنے ابتدائی چند سالوں میں غیر ملکی اور ملکی سرمائے کو مقامی صنعت میں سرمایہ کاری کی ترغیب دی وہیں کچھ ایسے اقدامات بھی اٹھائے تاکہ سرمایہ کاری کا رخ ایسی صنعتوں کی جانب کیا جا سکے جہاں جدید ٹیکنالوجی درکار تھی۔ ان صنعتوں میں سرمایہ لگانے والوں کو ٹیکس سے چھوٹ اور بعض دوسری سہولیات فراہم کیں۔ اور اس کے بدلے میں مقامی خام مال اور ۶۰ فیصد منافع کی دوبارہ سرمایہ کاری کی شرائط شامل کیں ساتھ ہی ۱۹۶۰ء میں غیر ملکی فرموں میں پاکستانی ملازمین کی تعداد میں اِضافہ کیا جانے لگا۔ ۱۹۶۳ء سے غیر ملکی کمپنیوں کے لیے نئے منصوبوں کی تعمیر کے لیے حکومت سے اجازت لینا ضروری قرار دیا گیا۔

بیرونی سرمائے پر ریاستی کنٹرول کے بڑھنے سے اور مقامی سرمائے کی آشیرباد کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ مخلوط کمپنیوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ تاہم یہ وضاحت ضروری ہے کہ حکومت کی جانب سے ان تمام اقدامات کا مقصد قومی مفادات کا تحفظ نہ تھا بلکہ اس سارے عمل سے مقامی بورژوازی کو عالمی تقسیم محنت میں اپنا حصہ حاصل کرنا تھا۔ مقامی سرمایہ دار نہ تو ریاستی مشینری میں اس قدر اثر و نفوذ رکھتی تھی نہ ہی سیاسی و اقتصادی طور پر اتنی مضبوط تھی کہ وہ عالمی سرمایہ داری نظام سے مخالفت مول لیتی اور اپنی منڈی کو خود اپنے قبضے میں لیتی۔ اس لیے اس نے عالمی اجارہ داروں سے مصالحت و باہمی اشتراک کی حکمتِ عملی اپنائی۔

۱۹۶۶ء میں ۲۴۴ مخلوط کمپنیاں وجود میں آچکی تھیں جو مجموعی بیرونی سرمایہ کاری کا ۶۶ فیصد حصہ کنٹرول کرتی تھیں جبکہ ایسی کمپنیاں جو پاکستان سے باہر رجسٹر تھیں صرف ۲۵ فیصد سرمائے کی مالک تھیں لیکن ۶۰ عشرے کے اختتام تک مخلوط کمپنیوں میں اضافے کا رجحان برقرار نہیں رہا جس کی وجہ زبردست عوامی ابھار کے نتیجے میں ایوب خان کی فوجی حکومت کا زوال تھا۔ دوسری طرف اسی عرصے میں سرمایہ کاری کے شعبہ جاتی ڈھانچے میں بھی نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

۱۹۶۹ء میں مجموعی سرمایہ کاری کا ۳۰ فیصد حصہ خام مال تیار کرنے کی صنعت، ۲۵ فیصد تجارت، بنکوں، جہاز رانی اور خدمات اور بقیہ ۴۵ فیصد کان کنی کی صنعت میں تھا۔ پاکستان کی آزادی کے پہلے دس سالوں میں جہاں پیداوار روایتی شعبوں میں تھی تو ۶۰ عشرے میں بیرونی سرمائے کا رخ نئی صنعتوں کی جانب موڑا گیا جس میں دواسازی، پیٹروکیمیکل، زرعی مشینری، مشین سازی، مصنوعی کھاد اور توانائی کے شعبے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ روایتی شعبوں میں (بنکوں، انشورنس، ہلکی صنعت کے چند شعبے، پٹ سن، ٹیکسٹائل اور چند دوسرے شعبے) ان کے سرمائے کو

محدود کیا گیا جس کے نتیجے میں نئی سرمایہ کاری کا ۵۰ فیصد حصّہ نئے شعبوں میں تھا۔

حجم کے لحاظ سے برطانوی سرمایہ ۱۹۷۱ء تک حاوی رہا جبکہ نئی ہونے والی سرمایہ کاری میں امریکی اُجارہ داروں نے برطانیہ کو جلد ہی پیچھے چھوڑ دیا۔ جاپان اور مغربی جرمنی بھی اپنا سرمایہ مقامی صنعت میں لگانے لگے۔ بیرونی سرمائے کی پوزیشن میں بھی نمایاں تبدیلی آئی۔ اگر آزادی کے ابتدائی سالوں میں نسبتاً تھوڑے سرمائے سے بیرونی اُجارہ دار ملکی معیشت کے اہم اور کلیدی شعبوں پر قابض تھے تو ۶۰ عشرے میں باوجود اس کے کہ بیرونی سرمائے کا حجم ۲۰ - ۳۰ گنا بڑھ چکا تھا۔ پاکستانی سرمائے نے صنعت کے بہت سے شعبوں پر خود قبضہ جما لیا۔ بیرونی سرمائے پر ریاستی پابندیوں نے بڑی حد تک اس چیز کو ممکن بنایا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حصص والی کمپنیوں کی مجموعی تعداد میں بیرونی سرمائے سے چلنے والی کمپنیوں کا حصہ ۳۰ فیصد سے کم ہو کر ۱۵ فیصد رہ گیا۔

بنگلہ دیش کے وجود میں آنے کے بعد بیرونی سرمایہ دو حصّوں میں بٹ گیا، لیکن پھر بھی غیر ملکی سرمائے کا بڑا حصہ پاکستان ہی میں رہا جہاں یہ پنجاب اور کراچی میں مرتکز تھا جو نقل و حمل کے وسائل کے اعتبار سے نسبتاً ترقی یافتہ علاقے تھے۔

بھٹو کے دورِ حکومت میں حالانکہ صرف وہی کارخانے تحویل میں لیے گئے جو مقامی اجارہ دار سرمایہ داروں کی ملکیت تھے۔ اور بیرونی نجی سرمائے کو نہیں چھیڑا گیا، مگر ریاستی کنٹرول کے بڑھنے سے غیر ملکی سرمایہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ان اقدامات میں اندرونی منڈی اور پیداوار میں ریاست کا بڑھتا ہوا عمل دخل، غیر ملکی بنکوں کو کچھ شہروں تک محدود کرنا، غیر ملکی اور مخلوط کمپنیوں کے

OPERATIONS پر ریاستی کنٹرول کو بڑھانا شامل تھے جن سے بیرونی سرمایہ خوف زدہ تھا اور نئی سرمایہ کاری بالکل ختم ہو کر رہ گئی تھی حتیٰ کہ کچھ کمپنیوں نے اپنا سرمایہ باہر منتقل کرنا شروع کر دیا تھا لیکن جوں جوں سیاسی اقتدار مستحکم ہونا شروع ہوا اور سرمایہ کاری کے لیے فضا پھر سے سازگار ہوئی بیرونی سرمایہ دوبارہ اندر آنے لگا۔

۱۹۷۷ء سے فوج کے دوبارہ برسر اقتدار آنے پر موجودہ حکومت نے غیر ملکی سرمائے کو ہر ممکن تحفظ دینے کا یقین دلایا اور ہر طریقے سے انھیں صنعت میں سرمایہ کاری کی ترغیب دی گئی۔ اس خطے کے قرب و جوار میں سیاسی تبدیلیوں نے پاکستان کی اہمیت میں اضافہ کیا اور سامراج نے بڑے پیمانے پر اُسے امداد کی فراہمی شروع کر دی۔ پانچویں پانچ سالہ منصوبے میں نجی سرمایہ کاری کا ہدف ۵۰ فیصد مقرر کیا گیا۔ ۸۳-۱۹۷۸ء کے درمیان صنعتی سرمایہ کاری میں پیداواری صلاحیت اور پیداوار کو جدید بنانے میں لگائے جانے والے سرمائے میں غیر ملکی زرمبادلہ کا تخمینہ ۴۵ فیصد لگایا گیا جو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ زرمبادلہ اور غیر ملکی ٹیکنالوجی پر پاکستان کا بڑھتا ہوا انحصار حکومت کو قومی اور غیر ملکی بزنس کے درمیان تعلقات کو زیادہ بڑھاوا دینے پر مجبور کرتا ہے۔ چھٹے پانچ سالہ منصوبے میں جہاں ریاستی سیکٹر کے کردار کو ۲۵ فیصد تک محدود کرنے کی بات کی گئی ہے وہیں نجی غیر ملکی سرمائے کا حصّہ غیر معمولی طور پر بڑھانے پر زور دیا گیا ہے۔

برطانوی سرمایہ اور اجارہ دار

پاکستان میں سرگرم عمل عالمی اجارہ داریوں میں برطانیہ کا حصّہ نمایاں ہے۔
جس کی مجموعی مالیت ۱۲۷۷ ملین روپے ہے۔ (۳۸.۵ فیصد)

۱۔ کپاس کی ابتدائی تیاری۔

a. R. SIM & CO. LTD.
b. JAMES FINLAY
c. RELLY BROTHERS
d. ROBERTS ASSOCIATION

۲۔ خوردونوش کی اشیاء۔

a. UNILEVER
b. BROOKE BOND

۳۔ تعمیراتی۔

a. GAMMON
b. MACDONALD LAYTON CONST.

۴۔ بنیادی کیمیا۔

a. PAKISTAN OXYGEN
b. IMPERIAL CHEMICAL INDUSTRIES
c. RECKITT & COLLMAN OF PAKISTAN

۵۔ سگریٹ۔

a. PAKISTAN TOBACCO
b. GOODLAY PHILIPS

۶۔ دواسازی۔

a. GLAXO LABORATORIES
b. MAY & BAKER
c. PARKE DAVIS & COMPANY

۷۔ برقی ساز و سامان۔

a. GENERAL ELECTRIC CO. OF PAKISTAN
b. JOHNSON & PHILIPS
c. BRITISH INSULATED CALENDERS CABLES
d. ELECTRIC LAMP MANUFACTURERS OF PAKISTAN
e. GREAVES KROMPTON & CO.

۸۔ ٹریکٹر سازی

a. MESSY FURGOUSON
b. VAULKSHALL & BEDFORD VIKAUS
c. BRITISH LAYLAND MOTOR CORP.

۹۔ تیل وایندھن۔

SHELL گروپ کی دس کمپنیاں سرگرم عمل ہیں جو تیل کی تلاش، حصول،

درآمد اور تجارت میں حصہ لیتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ گروپ کچھ پاکستانی کمپنیوں کے حصص کے مالک بھی ہیں۔ (انڈس گیس کمپنی۔ کراچی گیس کمپنی)۔

پاکستان میں انگلستان کا سارا سرمایہ نجی اجارہ داروں کا ہی نہیں ہے بلکہ
COMMON WEALTH DEVELOPMENT
FINANCE CORPORATION
نامی تنظیم جس میں انگلستان اور دولت مشترکہ سے تعلق رکھنے والی ۱۶۰ بڑی کمپنیاں شامل ہیں۔ یہ کارپوریشن بہت سی بڑی پاکستانی کمپنیوں کے حصص کی مالک ہے۔
(SUI GAS TRANSMISSION LTD HYESONS SUGAR MILLS PAKISTAN PAPERS CORP. اور بعض دوسرے)

امریکی سرمایہ اور اجارہ دار

۱۹۵۰ء ویں عشرے کے اختتام تک امریکہ اور پاکستان کے درمیان سیاسی و فوجی تعاون کے باوجود نجی سرمایہ کاری کی رفتار بہت کم تھی، لیکن اس عرصے میں امریکی حکومت نے اپنے اجارہ داروں کے لیے پاکستانی حکام سے بہت سی گارنٹیاں اور رعایتیں حاصل کرنا شروع کر دیں۔ ۶۰ عشرے میں معاہدوں پر دستخط ہوئے جس کے نتیجے میں امریکی سرمایہ بھاری مقدار میں اندر آنے لگا اس وقت امریکی سرمایہ مجموعی رقم کے اعتبار سے برطانوی سرمائے سے زیادہ ہے اور اس میں اضافے کی شرح برطانوی سرمائے سے بڑھی ہوئی ہے۔

۱۹۸۰ء میں کل امریکی سرمایہ ۱۴۶۳ ملین روپے تھا جو کہ مجموعی غیر ملکی سرمایہ کاری کا ۵ء۲۴ فیصد حصہ بنتا ہے۔ امریکی سرمایہ زیادہ تر تیل اور گیس کی تلاش اور ان کی مصنوعات کی تجارت، کیمیاوی کھاد کی پیداوار، آٹو موبائیل، دواسازی اور انشورنس میں مرتکز ہے۔

۱۔ تیل کی کمپنیاں۔

b. CALTEX
c. STANDARD OIL
d. ESSO

۲۔ کھاد۔

a. EXXON
b. ADAMJEE AMERICAN CYNAMID
c. DAWOOD HERCULIES CHEMICALS
d. HYESONS AGRICULTURAL CHEMICALS.

۳۔ موٹر سازی اور ٹریکٹر سازی۔

امریکی اجارہ دار کمپنیاں (فورڈ، جنرل موٹرز، میک ٹرک ان کارپوریشن، انٹرنیشنل ہارویسٹر) ٹریکٹر اور موٹر سازی کی اسمبلنگ اور زرعی مشینری کی پیداوار اور تجارت میں مصروف عمل تھیں بھٹو کے دورِ حکومت سے پہلے جب مقامی سرمائے کے حصے کو قومیایا گیا تو اجارہ داروں نے آدم جی، داؤد، وزیر علی، یوسف، شیرازی اور دوسرے اہم صنعت کاروں کے ساتھ مخلوط کمپنیاں بنائیں۔

۴۔ دوا سازی۔

a. CYNAMID
b. LEDRELLE LABS.

۵۔ ربر۔

a. GENERAL TYRE & RUBBER CO.

۶۔ انشورنس و بینکنگ۔

a. AMERICAN LIFE INSURANCE
b. BANK OF AMERICA

پچھلے چند سالوں سے جاپانی سرمایہ بھی پاکستانی معیشت میں اثر و نفوذ میں اضافہ کر رہا ہے۔ P.T.V صنعتی ترقیاتی بینک PAK SUZUKI وغیرہ میں ریاستی سرمائے کے ساتھ اشتراک کیے ہوئے ہے جبکہ کچھ نجی کمپنیوں کے ساتھ PAKISTAN PVC MUNNOO MOTORS وغیرہ میں حصہ دار ہے۔ لیکن جاپانی اجارہ داروں کی صحیح پوزیشن کا اندازہ ان درآمدات سے لگایا جا سکتا ہے جن کے ذریعے ملکی معیشت جاپانی سرمائے سے نتھی ہے۔ یہ درآمدات جو مختلف ذریعوں سے پاکستان پہنچ رہی ہیں جن

میں موٹر گاڑیاں، زرعی مشینری، الیکٹرانک مصنوعات اور اشیأ صرف کی بعض دیگر مصنوعات شامل ہیں۔

مغربی جرمنی بھی بجلی کے ساز و سامان SIEMENS ٹیلی فون، ریڈیو اور بنکوں میں سرمایہ کاری کر چکا ہے۔ مغربی جرمن سرمائے سے DEUTCH BANK DREZDEN BANK بھی مصروفِ عمل ہے۔

اجارہ دار کمپنیوں کا طریقۂ واردات اور اسکے نتائج

۶۰ عشرے کے مقابلے میں جب بیرونی اجارہ دار مقامی سرمایہ دار کو برابر کا حصے دار مانتے ہوئے نصف حصص ان کے ہاتھ فروخت کر دیتا تھا تو ۷۰ ویں اور ۸۰ ویں دھائی میں یہ حکمت عملی بدلی اور اب زیادہ تر مخلوط کمپنیوں میں غیر ملکی اجارہ داروں کے حصص زیادہ ہیں۔ بالواسطہ سرمایہ کاری کے علاوہ اجارہ دار اپنی مشینری کریڈٹ پر مہیا کرتے ہیں۔ زیادہ تر سرمایہ کیش کی صورت میں آتا ہے اور سرمائے کا صرف چھوٹا سا حصہ مشینری کے حصول پر خرچ ہوتا ہے۔ اپنے حصے کے منافع کے علاوہ غیر ملکی اجارہ دار ٹیکنیکل فیس، رائلٹی اور ٹریڈ مارک کے استعمال پر بھی خاصی رقم وصول کرتے ہیں۔ زیادہ تر کمپنیوں میں ریٹائرڈ فوجی و سول افسران اونچے عہدوں پر فائز ہیں جن سے حکومت سے رابطے کا کام لیا جاتا ہے۔

اگر ملک کے اندر لگائے جانے والے سرمائے اور منافع کی شکل میں باہر لے جانے والے سرمائے کا موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت میں نئی سرمایہ کاری نہ ہونے کے برابر ہے بلکہ کچھ سالوں میں تو باہر لے جائی جانے والی رقم کہیں زیادہ ہے۔ صرف ۱۹۸۰ء میں ملکی معیشت میں مجموعی غیر ملکی سرمایہ کاری ۲۹۳ر۲ ملین روپے تھی جبکہ اسی عرصے میں صرف ۲۵، اجارہ دار کمپنیاں جو اسٹاک ایکسچینج میں

رجسٹر ہیں۔ منافع، ٹیکنیکل فیس، رائلٹی وغیرہ کی شکل میں ۳۷۶ ملین روپے باہر لے گئے۔ اور اگر اس رقم کو بھی گنا جائے جو یہی اجارہ دار خام مال کی خرید پر اپنی PARENT کمپنیوں کو ادا کرتے ہیں تو اس میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہی خام مال جو بین الاقوامی منڈی میں انتہائی سستے داموں میں دستیاب ہے۔ اپنی کمپنیوں سے دوگنے تگنے داموں میں خریدا جاتا ہے۔ پوری دنیا میں ان کمپنیوں کا جال اس طرح پھیلا ہوا ہے کہ کمپنی خام مال ایک ملک میں تیار کرتی ہے اور اس کی مصنوعات دوسرے ملک میں اور اس کی مارکیٹنگ تیسرے ملک میں کرتی ہے حالانکہ اس وقت پاکستان میں ایسا خام مال موجود ہے جس کو دواسازی کی صنعت کے لیے تیار کیا جا سکتا ہے لیکن حکومت کی جانب سے ہدایات اور خود اپنے وعدوں کے باوجود یہ اجارہ دار خام مال کی پروسیسنگ کی صنعت لگانے سے گریز کر رہی ہے۔ خود حکومت غیر ملکی مفادات کی اس حد تک تابع ہے کہ وہ قومی معیشت کو خود انحصار بنانے پر کوئی موثر حکمت عملی اپنانے سے قاصر ہے غیر ملکی مخالفت کے باوجود پاکستان اسٹیل کا قیام گزشتہ حکومت کے ان اقدامات میں شامل کیا جا سکتا ہے جو ملک کو کسی حد تک آزاد دیکھنا چاہتی تھی، لیکن موجودہ حکومت اسٹیل ملز کے DOWN STREAM صنعتوں میں سرمایہ کاری کے لیے زیادہ دلچسپی ظاہر نہیں کر رہی۔ الٹے ان تمام مصنوعات کی درآمد کی اجازت دی جا رہی ہے جو اسٹیل ملز میں تیار ہو رہی ہیں

(بلٹ)

غیر ملکی مصنوعات کو مشتہر کرنے پر بے شمار سرمایہ خرچ کر رہے ہیں جس سے غیر ضروری اشیاء کی مانگ کو مصنوعی طریقے سے بڑھایا جاتا ہے۔ سگریٹ، کاسمیٹک وغیرہ کے بیسیوں برانڈ منڈی میں متعارف کروائے جا رہے ہیں جو صحت کے لیے مضر ہیں۔ ماہرین کے مطابق تمام امراض کے لیے صرف

۲۰۰ بنیادی دوائوں کی ضرورت ہے جبکہ پاکستان میں اس وقت ۲۵۰۰ ادویات بازار میں دستیاب ہیں جن میں سے بیشتر ایسی ہیں جن پر مغربی ممالک پابندی عائد کر چکے ہیں کیوں کہ یہ ادویات بہت سی مہلک بیماریوں کا باعث ہیں۔ دواساز صنعت جس کا ۹۵ فیصد حصہ ۸ عالمی اجارہ دار کمپنیوں کے قبضے میں ہے، پیکنگ کا ۸۰ فیصد اور خام مال کا ۹۹ فیصد حصہ درآمد کر رہی ہیں جن سے قیمتی زرِ مبادلہ بھی ضائع ہو رہا ہے۔

اس کے باوجود کہ غیر ملکی کمپنیوں میں محنت کش عوام نسبتاً بہتر اجرت حاصل کرتے ہیں وہ ADDED VALUE کے صرف ۲۰-۱۵ حصے کے حقدار ہیں جبکہ اپنی کمپنیوں کی مغربی ممالک میں شاخوں میں کام کرنے والے مزدور ADDED VALUE جمع قدر کا ۷۰-۶۰ حصہ حاصل کرتا ہے۔

وہ ۲۵ TNC'S جو اسٹاک ایکسچینج میں رجسٹرڈ ہے کا ٹیکس ادا کرنے کے بعد منافع PAID UP CAPITAL کا ۲۶ فیصد بنتا ہے جو پاکستانی صنعت کا فی بہتر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ریاستی مشینری کا سے تعاون بھی حیرت انگیز ہے۔ جہاں حکومت نے بہت سی ایسی اشیائے کی درآمد کی اجازت دے رکھی ہے۔ جو پاکستانی صنعتکار تیار کرتے ہیں وہاں غیر ملکی کمپنیوں کی مصنوعات بلا شرکت غیرے مقامی منڈی کو اپنے قابو میں رکھے ہوئے ہیں۔

مجموعی غیر ملکی نجی سرمایہ کاری اور اسکی شعبہ جاتی تقسیم

۱۹۸۰ء میں مجموعی غیر ملکی سرمایہ کاری ۸۰۷٫۵ ملین روپے تک پہنچ گئی تھی جس میں امریکہ ۴۲ فیصد اور برطانیہ ۳۸ فیصد سرمائے کے حصے دار تھے۔ نجی سرمایہ کاری کی سالانہ کارکردگی ۱۹۷۳ء میں ۲۳٫۶ ملین روپے سے بڑھ کر ۱۹۸۰ء میں

۲۹۳٫۴ ملین روپے تک پہنچ گئی جبکہ ۱۹۷۷ء میں یہ ۴۴۶٫۸ ملین روپے کی حد کو چھو رہی تھی۔ یہاں یہ یاد رکھا جائے کہ بیرونی سرمایہ کاری کا حجم صرف ملک کے اندرونی حالات سے ہی متعین نہیں ہوتا بلکہ سرمایہ داری کے عالمی بحران جو روز بروز شدید ہوتا جارہا ہے کے نتیجے میں بھی سرمایہ کاری میں کمی بیشی آتی رہتی ہے۔

۱۹۷۳-۸۰ء کے درمیان سرمایہ کاری میں اوسط سالانہ اضافہ ۴۳٫۳ فیصد رہا جن میں کیش میں اضافہ ۱۲۰٫۳ فیصد، مشینری میں اضافہ ۴۷٫۴ فیصد اور دوبارہ سرمایہ کاری REINVESTMENT ۲۳٫۸ فیصد رہی۔

پاکستانی معیشت میں TNC'S کی سرمایہ کاری کا مجموعی حجم قومی آمدنی GNP کا ۴ فیصد ہے۔ تیار کردہ مصنوعات کی برآمدات میں ان کا حصہ ۱۰ فیصد کے برابر ہے۔

اسٹاک ایکس چینج میں رجسٹرڈ ۲۵ TNC'S میں دو کا تعلق تمباکو کی صنعت سے، ایک کا ایندھن، ۵ کا انجنیئرنگ سے، ۱۱ کا تعلق کیمیکل اور فارماسیوٹیکل، ایک کا گھی سے اور دو کا تعلق تعمیرات سے ہے۔ ان کے علاوہ مشروبات چائے، رنگ وروغن، بجلی سے متعلق سازوسامان، کان کنی، جفت سازی، ٹن وغیرہ میں بھی اجارہ داروں کو معتبر حیثیت حاصل ہے۔ ان صنعتوں میں پیداواری صنعت کے ۲۵ فیصد بنیادی ذرائع ۳۳ فیصد پیداوار اور ۳۵ فیصد ADDED VALUE مرتکز ہے۔ حالانکہ TNC'S میں GNP کا حصہ زیادہ نہیں ہے لیکن اگر ان صنعتوں کی اہمیت کو مدِّنظر رکھا جائے تو TNC'S کا کردار کافی مضبوط ہے۔

غیر ملکی اُجارہ دار اور پاکستانی سرمایہ دار

غیر ملکی اُجارہ داروں کے ساتھ تعاون اور صنعتی طور پر ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک کی مالی امداد قومی اجارہ دار سرمائے کو تقویت پہنچا رہی ہے۔ غیر ملکی کمپنیاں سرمائے کے ارتکاز میں ایک ترغیبی عنصر کا کردار ادا کر رہی ہیں۔ نجی بیرونی سرمایہ عموماً بڑے قومی سرمائے سے اشتراک کرتا ہے کیونکہ وہ چھوٹے اور درمیانے درجے کی کمپنیوں سے تعاون کو منافع بخش نہیں سمجھتے۔

ملکی اُجارہ دار سرمایہ دار اپنے وسائل کی بنا پر زیادہ بہتر طریقے سے غیر ملکی اجارہ دار سے مقابلے کی صلاحیت رکھتا ہے حتیٰ کہ بعض اوقات اپنی اندرونی منڈی میں ان کا داخلہ محدود کر سکتا ہے۔ لیکن یہاں اس کے لیے ایسی اقتصادی اور سیاسی بنیاد موجود نہیں ہے کہ وہ جدید پیداوار کے لیے مشینری اور اس کے استعمال میں خود انحصار ہو سکے اس لیے ان حالات میں قومی اور غیر ملکی سرمائے کے درمیان تضادات عمومی طور پر آپس میں عام سرمایہ دارانہ مقابلے کا کردار اپنا لیتے ہیں۔

یہاں ہم خود ریاستی مشینری اور مقامی سرمائے کے درمیان تعلقات کی نوعیت کو واضح کرتے چلیں۔ ریاست جہاں مقامی وہیں بیرونی سرمائے کے مفادات کا تحفظ کرتی ہے لیکن خود مقامی سرمایہ دار حکومت میں اپنی سیاسی قوت کے طور پر موجود نہیں ہے اور وہ بڑی حد تک بیوروکریسی سے مشترکہ مفادات کے ذریعے اپنا رابطہ رکھے ہوئے ہے جبکہ ریاست خود اکثر اوقات بیرونی مفادات کے تحفظ کو ترجیح دیتی ہے اور اس کا سامراج پر انحصار اسے ایسی پالیسیاں بنانے پر مجبور کر دیتا ہے جو مقامی بورژوازی کے مفادات میں نہیں ہوتیں۔ باوجود تمام زبانی اعلانات کے ہماری ریاستی مشینری عالمی سرمایہ داری نظام کے تابع ہے اور یہاں ایسی صنعت

کا فروغ ناممکن ہے جس کے مفادات سامراج سے تضاد رکھتے ہوں۔ حکومت اس بات پر مجبور رہے کہ اپنی منڈی کو باہر کی مصنوعات کی درآمد کے لیے کھولا جائے اور یہاں مقامی بورژوازی (درمیانے اور چھوٹے درجے کی) سے اس کا تضاد پیدا ہوتا ہے جو ماضی میں ایوب حکومت کے زوال کا سبب بنا۔ اس وقت ملک میں کوئی بھی بڑا سرمایہ دار نہیں ہے جو بیرونی اجارہ داروں سے اشتراک نہ کر رہا ہو۔

بیرونی سرمایہ کاروں کا ایک مضبوط تجارتی رشتہ ان چھوٹے سرمایہ داروں سے بھی بنتا ہے جو ان کی مصنوعات کو مقامی منڈی میں فروخت کرتے ہیں۔ یہ طبقہ تاجروں، دوکانداروں، ہول سیل ڈیلروں وغیرہ پر مشتمل ہے۔ ان میں وہ تاجر بھی شامل ہیں جو غیر ملکی مصنوعات کی درآمدات کے ذریعے مالدار ہو رہے ہیں اور اپنی تجارتی سرگرمیوں کا وسیع جال رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ملکی برآمدات کی صنعت کے مفادات بھی غیر ملکی صنعت کاروں سے وابستہ ہیں۔ اگر یہ تمام لوگ تعداد میں زیادہ نہ بھی ہوں تو ان کے نفسیاتی اثرات آبادی کے وسیع حصے پر محیط ہیں۔ اس وقت ایسے سرمائے کی نشان دہی مشکل ہے جو ان غیر ملکی اجارہ داروں کے اثر کو مؤثر طور پر چیلنج کر سکے کیوں کہ جن صنعتوں کے فروغ کے لیے غیر ملکی اثرات کا قلع قمع کرنا ضروری ہے وہ بھی غیر مستحکم سیاسی، جغرافیائی صورتحال کی وجہ سے کوئی ایسا قدم اٹھانے کی پوزیشن میں نہیں ہے، لیکن بنیادی مشین سازی کی صنعت کے فروغ پانے سے اس بات کا امکان موجود ہے کہ مقامی منڈی کو غیر ملکی سرمائے کے لیے محدود کرنے کے لیے مقامی صنعت کاروں کا دباؤ شدید ہو۔ اس سلسلے میں سوشلسٹ ممالک کے تعاون سے لگنے والی صنعت سے کافی توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

حقیقت میں مقامی صنعت کاروں کا بڑا تضاد حکومتی کنٹرول سے بنتا ہے
جس نے صنعت پر لاتعداد پابندیاں عائد کر رکھی ہیں جو نوکر شاہی کو زیادہ رشوت
وصول کرنے کی حقدار بناتی ہیں اسی لیے باوجود تمام زبانی بات چیت کے صنعت کی
طرف سے سرمایہ تجارت میں منتقل ہو رہا ہے جو عنقریب اِفراطِ زر میں بدترین
اِضافہ کرے گا اور معیشت کو تباہی کے کنارے پہنچا سکتا ہے۔

اختتامیہ

اس صورتحال میں پچھلے چند سالوں سے موجودہ حکومت کی یہ کوشش رہی ہے
کہ مقامی معیشت میں بیرونی سرمایہ کاری کو فروغ دیا جائے۔ اس کے لیے ایکسپورٹ
پروسیسنگ زون کا قیام بھی عمل میں لایا گیا اور TNC'S کو لاتعداد سہولتیں مہیا
کی گیئں لیکن بیرونی سرمائے کی جانب سے کوئی خاص ردِّ عمل کا مظاہرہ نہیں ہوا
بیرونی سرمائے کی عدم دلچسپی کا راز صرف سیاسی عدم استحکام نہیں ہے بلکہ اس
کی وجہ عالمی سرمایہ داری کا وہ بحران ہے جس کے باعث وہ اپنی پیداواری صلاحیت
کو پوری طرح زیرِ استعمال نہیں لا سکتے LOW CAPACITY UTILIZATION
اور کساد بازاری ہے جس نے عالمی اُجارہ داروں کو بہت سی مشکلات میں دھکیل
دیا ہے۔

بین الاقوامی مالیاتی اداروں میں مندی کے رجحانات کو دیکھتے ہوئے یہ
بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ تیسری دنیا کے ممالک کو زیادہ سے زیادہ قرضے فراہم
کر رہے ہیں جن کو قبول کرنے پر ترقی پذیر ممالک اپنی منڈیوں کو بیرونی مصنوعات
کے لیے کھولنے پر مجبور ہوتے ہیں اور اپنی کرنسی کی قیمت مستقل کم کرتے جا رہے
ہیں LOW CAPACITY UTILIZATION کے باعث اس چیز میں زیادہ دلچسپی

لیتے ہیں کہ وہ ترقی پزیر ممالک کو اپنی زیادہ سے زیادہ مصنوعات بیچ سکیں نہ کہ وہاں صنعت لگائیں۔

پاکستان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہو رہا ہے اس سال پاکستان کو مدد فراہم کرنے والے کنسورشیم نے پاکستان کی جانب سے مطالبہ کردہ قرضے سے ۲۷ فیصد زائد رقم فراہم کی جس سے پاکستان کے قرضوں کے بوجھ میں اضافہ ہوا ہے جبکہ نئے قرضے انھیں سود کی بڑھتی ہوئی شرح پر فراہم کیے گئے ہیں۔ پاکستان کو ملنے والے قرضوں کا صرف ۲۰-۱۵ فیصد ہی مل پاتا ہے جبکہ اس کے بدلے میں پاکستان نے درآمدات کو بڑھایا ہے کرنسی کی قیمت کو مستقل کم کیا جارہا ہے اور افراطِ زر میں زبردست اضافہ ہو رہا ہے۔

ان حالات میں ہر سمت سے پاکستان کا استحصال بڑھتا جارہا ہے۔ عالمی اجارہ دار کمپنیوں کو کسی مثبت سیاسی تبدیلی کی صورت میں فوری طور پر قومیایا جانا ایک اہم ضرورت بن چکا ہے، لیکن ان کمپنیوں کا عالمی ڈھانچہ اس اقدام کی راہ میں کافی سنگین مسائل کھڑے کرسکتا ہے، لیکن ہمارے خیال میں بین الاقوامی مارکیٹ اور سوشلسٹ ممالک کے تعاون سے ان مسائل پر قابو پانے میں کافی حد تک مدد مل سکتی ہے۔

خالد ندوی ، اکبر زیدی

PAKISTAN: ROOTS OF DICTATORSHIP

حسن گردیزی اور جمیل رشید (ایڈیٹرز)

زیڈ پریس ۱۹۸۳ء، ۳۹۶ صفحات (اس کتاب کا پاکستانی ایڈیشن PAKISTAN : THE UNSTABLE STATE کے عنوان سے وین گارڈ پبلشرز کی جانب سے شائع ہو چکا ہے۔)

یہ امر ہرگز خوش آئند نہیں ہے کہ پاکستان کے مختلف مسائل پر ریڈیکل نظریاتی نقطۂ نظر رکھنے والے پاکستانی دانشوروں کی تحریروں کے پہلے مجموعے کا معیار توقعات پر پورا اترنے سے قاصر رہا ہے۔ مجموعہ کی بنیادی کمزوری مختلف مقالوں کے مصنفین کی بجائے ایڈیٹرز پر عائد ہوتی ہے۔ کتاب کے مواد کو جلدی میں اکٹھا کیا گیا ہے اور اس کی ادارت کو بخوبی انجام تک نہیں پہنچایا گیا۔

اس کتاب میں ۱۲، مصنفین کے ۱۶، مقالے شامل کیے گئے ہیں جو مجموعی کام کی غیر یکساں نوعیت کا ایک سبب ہو سکتے ہیں۔ بہت سے مسائل کو بار بار دہرایا گیا ہے۔ اور زیادہ تر مقالے تجزیاتی گہرائی رکھنے کی بجائے صحافتی اور مناظرے کی طرز پر لکھے گئے ہیں۔ سیاسی معاشیات کی روایت (جس کا مصنفین دعویٰ کرتے ہیں) کے سائنسی، نظریاتی بنیادوں کا واضح فقدان پایا جاتا ہے۔

حمزہ علوی پاکستان کے مانے ہوئے ریڈیکل دانشور ہیں۔ ان کے

بیرونی حلقے PERIPHERAL کی سرمایہ داری اور اس میں ریاست اور طبقات کے ڈھانچے پر تحقیق اُن کے جامع اور تجزیاتی نقطۂ نگاہ سے سخت گیر تحریر کا بیّن ثبوت ہیں، لیکن زیرِ بحث کتاب میں شائع ہونے والے ان کے دو مضامین اس معیار پر پورا نہیں اترتے۔ "ریاست اور طبقہ" کے عنوان سے شائع ہونے والے مقالے میں حمزہ علوی تاریخی معلومات کا ایک لا متناہی سلسلہ بیان کرتے ہیں لیکن اس میں ایسے تجزیاتی دھاگے کی کمی نظر آتی ہے جو ان حقائق کو باقاعدہ دلیل کی لڑی میں پرو سکے۔ مضمون کے پچاس صفحات کو آسانی سے اس سے آدھے صفحات میں سمویا جا سکتا تھا۔ اس مضمون کو علوی کے جدید نو آبادیاتی ریاست کی ابتدائی تھیوری کی بنیاد پر لکھا گیا ہے، لیکن بعد میں اس تھیوری کا بیرونی حلقے کی سرمایہ داری پر اطلاق (جو علوی کی جانب سے بعض دوسری تحریروں میں کیا گیا ہے) کا زیادہ تذکرہ نہیں ملتا جبکہ دیہی اشرافیہ پر آپ کا دوسرا مضمون مختلف شکلوں میں پہلے ہی کئی جگہ شائع ہو چکا ہے۔ اس میں دیے جانے والے بیشتر حقائق پرانے ہو چکے ہیں جبکہ اس میں پیش کی جانے والی دلیل (جو ان کے پیش کرنے کے وقت تو بہت اوریجنل تھیں) کی جگہ جدید تحقیق لے چکی ہے۔ اگر علوی اپنی توجہ زراعت میں طریقہ پیداوار کے عبوری دور کے متنازعہ مسئلے پر مرکوز رکھتے تو مضمون زیادہ کارآمد ہو سکتا تھا۔

ظفر شہید (پاکستان مزدور تحریک) راشد امجد (صنعتی طاقت کے بڑے صنعتی گھرانوں میں ارتکاز) اور شہناز روز (پنجابی گاؤں کی کیس اسٹڈی) کے مقالے قابلِ ذکر ہیں اور اونچا معیار رکھتے ہیں۔ شہناز روز نے دیہی طبقات میں سماجی رشتوں کی پیچیدگی کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے انھوں نے اس موقف کو شدت سے رد کیا ہے کہ ہمدرد یا فیاض جاگیردار درمیانے اور نچلی سطح کے کسانوں کے حالات بہتر بنانے میں مددگار ہو سکتے ہیں۔ انھوں نے اپنے مقالے میں انتہائی باریک بین سطح پر ایسی حیرت انگیز تفصیلات دی ہیں جن میں ریاست کی

مدد سے روایتی جاگیر داروں کو منافع خور سرمایہ دار کسانوں میں تبدیل ہوتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ ابھی تک لیبر پالیسی پر مزدور تحریک کے نقطۂ نظر سے بہت کم تحریریں منظرِ عام پر آئی ہیں۔ ظفر شہید کا جامع تحقیقی مقالہ اس کمی کا کافی حد تک ازالہ کرتا ہے اس میں مزدور تحریک کی جدوجہد کے عمومی خد و خال پر نظر ڈالتے ہوئے دکھایا گیا ہے کہ کس طرح ریاست کی جانب سے ٹریڈ یونین تحریک پر متواتر حملے ہوتے رہے ہیں حتیٰ کہ عوامی خیال کی جانے والی حکومت کے دور میں بھی مزدوروں کے حقوق اور اُمنگوں کو پسِ پشت ڈال دیا گیا۔ صنعتی منافع بخشی اور سرمایہ کاری کے لیے موزوں فضا قائم کرنے کے لیے موجودہ حکومت نے بھی زیادہ تنخواہ اور بہتر معیار زندگی کے مزدور مطالبات کو کچلنے کے لیے مختلف ذرائع استعمال کیے ہیں۔

صنعتی گھرانوں پر امجد کا مقالہ ان گھرانوں کی طرف سے معیشت کے صنعتی اور مالیاتی شعبوں پر کنٹرول حاصل کرنے کے عمل کو بیان کرتا ہے۔ ان گھرانوں کا ابھرنا ایک ایسا مظہر ہے جو بذات خود ایک تفصیلی سماجی و معاشی مطالعے کا طلبگار ہے۔ امجد براہِ راست یا PICIC کے ذریعہ لبرل تحرکات دینے کی ریاستی پالیسی کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مشرقی حصے کی مارکیٹ کے چھن جانے اور بھٹو کے دور میں بنکوں کے قومیائے جانے کے نقصان کے باوجود موجودہ حکومت کی صنعتی شعبے کو دی جانے والی مراعات ان کی سابقہ حیثیت کو بحال کرنے میں کافی مددگار ثابت ہو رہی ہیں بھٹو دور پر پہلے سے شائع ہونے والا اعجاز احمد کا مضمون اس حکومت کے کردار کا تجزیہ کرنے کی ایک اچھی کوشش ہے۔ اعجاز احمد بھٹو کے زوال کو ابھرنے والے معاشی بحران خصوصاً زرعی سرمائے اور صنعتی شعبے سے منسلک کرتے ہیں۔ ضیاء الحق کا آخری مضمون خاص اہمیت کا حامل ہے جس میں وہ ریاست اور حکمران طبقات کی جانب سے مذہب کے استعمال کو ایسا ہتھکنڈا قرار دیتے ہیں جس کے پسِ پردہ موجودہ استحصالی نظام پھل پھول سکے۔ حق اسلام کی اصل اور موجودہ "قرونِ وسطیٰ" کی تشکیل میں واضح فرق برتتے ہیں وہ سائنسی علم کے حصول میں حائل

دشواریوں کا ذکر کرتے ہیں جب اسے مذہبی عقیدہ پرستی کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن بدقسمتی سے وہ اپنی دلیل کو مزید آگے نہیں بڑھاتے۔

دونوں ایڈیٹرز کے دو دو مضامین کتاب میں شامل ہیں جب کہ ایک مضمون ان کی مشترکہ کاوش ہے۔ بدقسمتی سے یہ مضامین کتاب کا کمزور ترین حصّہ ہیں۔ دونوں مصنفین نے غیر دانشورانہ انداز سے لکھا ہے۔ اور عبدالرؤف (تعلیم) کی طرح مارکسی خطابت RHETORIC کو محض لفاظی کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ انیس عالم کا مختصر مضمون (سائنس اور انجنیئرنگ) بھی سطحی تجربے تک محدود ہے۔

اس مجموعے کو پڑھنے کے بعد واضح قسم کی تشنگی محسوس ہوتی ہے۔ بعض مصنفین کے ہاں اپنی دلیل کو معتبر ظاہر کرنے کے لیے بری طرح چُنی ہوئی مارکسی اصطلاحات کے استعمال کا رجحان نظر آتا ہے۔ اگر کتاب کی کوئی افادیت ہے تو وہ یہ کہ پہلی دفعہ مختلف پاکستانی ریڈیکل دانشوروں کی تحریروں کو یکجا کیا گیا ہے۔ جس سے قارئین کی بڑی تعداد مستفید ہو سکتی ہے، لیکن مجموعہ کا بنیادی تضاد اسی میں ہے کہ یہ واضح نہیں ہو پاتا کہ آیا یہ سیاسی تحریروں کا مجموعہ ہے یا علمی، اگر اس کا مقصد سیاسی اور علمی مقالوں کے امتزاج سے مجموعہ ترتیب دینا تھا تو وہ دونوں میں سے کسی چیز میں بھی کامیابی حاصل نہیں کر سکا۔ ہم امید رکھتے ہیں کہ پاکستانی سماج کے کردار کو سمجھنے کے لیے مستقبل میں کی جانے والی کوششوں میں زیادہ سنجیدگی اختیار کی جائے گی۔ جب تک ریڈیکل نظریات رکھنے والے حضرات ان پہلوؤں پر واضح نہیں ہوں گے کسی بھی سیاسی ایکشن کے امکانات تاریک رہیں گے۔

ریسرچ فورم کے تمام شماروں کی مکمل فہرستیں

مجموعہ نمبر ۲

* * *

مجموعہ نمبر ۳

صنعت کے بارے میں تفصیلی حقائق	ادارہ
ریاست اور طبقات	حمزہ علوی
پاکستان میں اخبارات کا کردار	زیڈ اے مرزا
پاکستان کا نظام صحت	اکبر زیدی
فرانز فینن	ر۔ اولیانووسکی
پنجابی ادب، ایک سوالیہ نشان	احمد سلیم
کتابوں پر تبصرہ	
نفسیات کا ارتقاء	احمد سلیم
پاکستان: پسماندگی اور زرعی ڈھانچہ	اکبر زیدی

مجموعہ نمبر۴ "یوم مئی نمبر"

مجموعہ نمبر ۵

ہمارے گزشتہ مجموعوں کے موضوعات

پاکستان کے مزدور طبقے کی تاریخ

ریاست اور طبقات

زرعی اصلاحات - ایک جائزہ

صوبہ سرحد کا سماجی ڈھانچہ

عالمی اجارہ داریاں اور پاکستان

پاکستان کا نظام صحت

جدید پنجابی ادب - ایک تاریخی جائزہ

عالمی مزدور تحریک

سندھ ہاری کمیٹی

پاکستان میں مزدور قوانین

پڙهندڙ نسُل . پَ نَ

The Reading Generation

1960 جي ڏهاڪي ۾عبدالله حسين ” اُداس نسلين“ نالي ڪتاب لکيو. 70 واري ڏهاڪي ۾ وري ماڻِڪَ ”لُڙهندَڙ نَسُل“ نالي ڪتاب لکي پنهنجي دورَ جي عڪاسي ڪرڻ جي ڪوشش ڪئي. امداد حُسينيءَ وري 70 واري ڏهاڪي ۾ئي لکيو:

انڌي ماءُ ڄڻيندي آهي اونڌا سونڌا ٻارَ
ايندڙ نسل سَمورو هوندو گونگا ٻوڙا ٻارَ

هر دور جي نوجوانن کي اُداس، لُڙهندَڙ، ڪَڙهندڙ، ڪُڙهندڙ، ٻَرندڙ، ڇُرندڙ، ڪِرَندڙ، اوسيئڙو ڪَندَڙُ، ياڙي، ڪاٺُو، ياڇوڪَڙُ، ڪاوڙيل ۽ وِڙهندڙ نسلن سان منسوب ڪري سَگهجي ٿو، پَر اسان اِنهن سيني وِچان ”پڙهندڙ“ نسل جا ڳولائو آهيون. ڪتابن کي ڪاڳر تان ڪٽي ڪمپيوُٽر جي دنيا ۾ آڻڻ، ٻين لفظن ۾ برقي ڪتاب يعنى e-books ناهي ورهائڻ جي وسيلي پڙهندڙ نسل کي وَڌَڻ، ويجهَڻ ۽ هِڪَ ٻِئي کي ڳولي سَهڪاريِ تحريڪ جي رستي تي آڻِڻَ جي آسَ رکون ٿا.

پَڙهندڙ نَسل (پَـنَ) ڪا بہ تنظيمَ ناهي. اُنَ جو ڪـو بـہ صدر، عُهديدار يا پايو وِجهندڙ نہ آهي. جيڪڏهن ڪو بہ شخص اهـڙي دعوىٰ ڪري ٿـو تـہ پَڪَ ڄاڻو تـہ اُهو ڪُوڙو آهي. نہ ئي وري پَـنَ جي نالي ڪي پئسا گڏ ڪيا ويندا. جيڪڏهن ڪـو اهڙي ڪوشش ڪري ٿو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُهو بہ ڪُوڙو آهي.

جَهڙيءَ طَرَح وڻـن جا پَـنَ ساوا، ڳاڙها، نيرا، پيلا يا ناسي هوندا آهن اَهڙيءَ طرح پَڙهندڙ نَسُل وارا پَـنَ بہ مختَلِف آهـن ۽ هوندا. اُهي ساڳئي ئي وقت اُداس ۽ پڙهندڙ، ٻَرندڙ ۽ پڙهندڙ، سُست ۽ پڙهندڙ يا وِڙهندڙ ۽ پڙهندڙ بہ ٿي سگهن ٿا. ٻيـن لفظن ۾ پَنَ ڪا خُصوصي ۽ تالي لڳل ڪِلَب Exclusive Club نہ آهي.

ڪوشش اها هوندي تـہ پَـنَ جا سڀ ڪَم ڪار سَهڪاري ۽ رَضاڪار بنيادن تي ٿين، پر ممڪن آهي تہ ڪي ڪم اُجرتي بنيادن تي بہ ٿِيـن. اهڙي حالت ۾ پَـنَ پاڻ هِڪَٻِئي جي مدد ڪَرڻ جي اُصولَ هيٺ ڏي وَٺُ ڪندا ۽ غيرتجارتي non-commercial رهندا. پَنَن پاران ڪتابن کي ڊِجيِٽائِيز digitize ڪرڻ جي عَملَ مان ڪو بہ مالي فائدو يا نفعو حاصل ڪرڻ جي ڪوشش نہ ڪئي ويندي.

ڪتابن کي ڊِجيِٽائِيز ڪرڻ کان پو ٻيو اهم مرحلو وِرهائڻ distribution جو ٿيندو. اِهو ڪم ڪرڻ وارن مان جيڪڏهن ڪو پيسا ڪمائي سگهي ٿو تہ پلي ڪمائي، رُڳو پَنَن سان اُن جو ڪو بہ لاڳاپو نہ هوندو.

پَنَن کي کُليل اکرن ۾ صلاح ڏجي ٿي تہ هو وَسَ پٽانڊڙ وڏِ کان وَڏِ ڪتاب خريد ڪَري ڪتابن جي ليکَڪَن، ڇپائيندڙن ۽ ڇاپيندڙن کي هِمٿائِن. پر ساڳِئي وقت عِلم حاصل ڪرڻ ۽ ڄاڻ کي ڦهلائڻ جي ڪوشش دوران ڪَنهن بہ رُڪاوٽَ کي نہ مڃن.

شيخ اَيازَ علمَ، ڄاڻَ، سمجهَ ۽ ڏاهپَ کي گيتَ، بيتَ، سِٽَ، پُڪارَ سان تَشبيهہ ڏيندي انهن سيني کي بَمن، گولين ۽ بارودَ جي مدِ مقابل بيهاريو آهي. اياز چوي ٿو تہ:

گيتَ بہِ جڻ گوريلا آهن، جي ويريءَ تي وار ڪَرن ٿا.

... ...

جئن جئن جاڙ وڌي ٿي جَڳَ ۾، هو بوليءَ جي آڙ ڇُپن ٿا؛

ريتيءَ تي راتاها ڪن ٿا، موٽي مَنجهہِ پهاڙ ڇُپن ٿا؛

... ...

ڪالهہَ هُيا جي سُرخ گُلن جيئن، اڄ ڪلهہ نيلا پيلا آهن؛

گيتَ بہِ جڻ گوريلا آهن........

... ...

هي بيتُ اَٿي، هي بَم- گولو،

جيکي بہ ڪٽين، جيکي بہ ڪٽين!

مون لاءِ بنهي ۾ فَرَقُ نہ آ، هي بيتُ بہ بَمَ جو ساٿي آ،

جنهن رِڻَ ۾ رات ڪَيا راڙا، تنهن هَڏَ ۽ چَمَ جو ساٿي آ ـ

اِن حسابَ سان اڄڪالهہ ڪي پاڻَ تي اِهو سوچي مَڙهڻ تہ ”هاڻي ويڙهہ ۽ عمل جو دور آهي، اُن ڪري پڙهڻ تي وقت نہ وڃايو“ ناداني جي نشاني آهي.

پَنَن جو پڙهڻ عام ڪِتابي ڪيڙن وانگر رُڳو نِصابي ڪتابن تائين محدود نہ هوندو. رڳو نصابي ڪتابن ۾ پاڻ کي قيد ڪري ڇڏڻ سان سماج ۽ سماجي حالتن تان نظر ڪڇي ويندي ۽ نتيجي طور سماجي ۽ حڪومتي پاليسيون policies اڻجاڻن ۽ نادانن جي هٿن ۾ رهنديون. پَنَ نِصابي ڪتابن سان گڏوگڏ ادبي، تاريخي، سياسي، سماجي، اقتصادي، سائنسي ۽ ٻين ڪتابن کي پڙهي سماجي حالتن کي بهتر بنائڻ جي ڪوشش ڪندا.

پَڙهندڙ نَسُل جا پَنَ سيني کي **چو، چالاءِ ۽ ڪينئن** جهڙن سوالن کي هر بَيانَ تي لاڳو ڪرڻ جي ڪوٺَ ڏين ٿا ۽ انهن تي ويچار ڪرڻ سان گڏ جوابَ ڳولڻ کي نہ رڳو پنهنجو حق، پر فرض ۽ اٽتر گهرج unavoidable necessity سمجهندي ڪتابن کي پاڻ پڙهڻ ۽ وڌ کان وڌ ماڻهن تائين پهچائڻ جي ڪوشش جديد ترين طريقن وسيلي ڪرڻ جو ويچار رکن ٿا.

توهان بہ پڙهڻَ، پڙهائڻ ۽ ڦهلائڻ جي اِن سهڪاري تحريڪ ۾ شامل ٿي سگهو ٿا. بَس پنهنجي اوسي پاسي ۾ ڏِسو، هر قسم جا ڳاڙها ٽوڙي نيرا، ساوا توڙي پيلا پن ضرور نظر اچي ويندا.

وڻ وڻ کي مون ياڪي پائي چيو تہ ”منهنجا ياءُ
پهتو منهنجي من ۾ تنهنجي پَنَ پَنَ جو پڙلاءُ“.
- اياز (ڪلهي پاتم ڪينرو)